آدھی رات کا شہر
اے حمید

آدھی رات کا شہر

(ناول)

اے حمید

آدھی رات کا شہر

جنوری کی ابر آلود رات ہے

ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی ہے۔ بہت سردی ہے۔ سرد برفیلی بھیگتی رات سے ہاتھ ملا کر سارا شہر ٹھٹھر رہا ہے۔ میکلوڈ روڈ کی دکانوں اور سائین بورڈوں کی رنگ برنگی روشنیاں گیلی سڑک پر چمک رہی ہیں۔ ابھی رات کے نو بجے ہیں لیکن میکلوڈ روڈ پر ویرانی چھا گئی ہے۔ بند شیشوں والی کاریں کبھی کبھی کیچڑ کے چھینٹے اڑاتی تیزی سے گزر جاتی ہیں فٹ پاتھ پر لوگ لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے اپنے گھروں کو جا رہے ہیں۔ کسی نے مفلر لپیٹ رکھا ہے کسی نے اوورکوٹ کا کالر اٹھا رکھا ہے کوئی پرانے کمبل کی بکل مارے چلا جا رہا ہے۔ ایک فقیر پھٹی ہوئی لوئی میں شاپان والے کی دکان کے پاس کونے میں دبکا ٹھٹھر رہا ہے۔ ایک دو منزلہ بس ابھی ابھی گزری ہے۔ اس کی پہلی منزل میں ایک لڑکی کھڑکی کے ساتھ لگی آدھا نقاب اٹھائے باہر تک رہی تھی۔ یہ اس وقت کہاں سے آ رہی ہے؟ شاید فلم کا دوسرا شو دیکھنے کے بعد اپنے عاشق سے اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے گھر واپس جا رہی ہے یا شاید اپنی بیمار ماں کے لئے دوائی لے کر آ رہی ہے۔ کیفے پال میں بڑی رونق ہے۔ بڑی گہما گہمی ہے۔ ہوٹل کی فضا گرم روشن اور سگرٹوں کے دھوئیں سے بوجھل ہو رہی ہے۔ لوگ میزوں کے اردگرد کرسیوں پر ست کر بیٹھے گرم گرم چائے پی رہے ہیں اور گرم جوشی سے باتیں بھی کر رہے ہیں۔ ہر میز پر اپنی الگ محفل جمی ہے۔ ہوٹل کے چاروں طرف سے بند کمرے میں پیالیوں سے چمچوں کے ٹکرانے کی آوازوں اور لوگوں کی دھیمی دھیمی باتوں کا مدھم شور اٹھ رہا ہے کسی وقت کوئی ہلکا سا قہقہہ بلند ہو کر فضا میں جذب ہو جاتا ہے۔

یاقوت ہوٹل کا شیشے دار دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے کیچڑ بھرے جوتے فٹ پیڈ پر رگڑے اوورکوٹ کے کندھوں پر ہاتھ مار کر بارش کا پانی جھاڑا اور چاروں طرف نظریں گھما کر نکڑ والی ایک میز کی طرف بڑھا۔ میز پر بیٹھے ہوئے دو آدمی اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ یاقوت ان کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور رومال سے ناک پونچھ کر بولا۔

"آج بڑی سردی ہے۔"

"بارش پھر شروع ہو گئی کیا؟"

"نہیں بوندا باندی ہی ہے۔ یہ تیز بارش سے بڑھ کر سردی لاتی ہے۔"

''چائے پیوگے؟''

''بارش' رات اور چائے!'' یاقوت نے سگریٹ سلگا کر کہا۔''اس دور کی سب سے بڑی تکون۔''

''اس تکون کا ایک اور زاویہ بھی ہے جو اس کو چوکور بنا دیتا ہے۔''

''اس کا نام لو۔''

''عورت۔۔۔۔۔۔۔جوان اور گرم عورت!''

یاقوت مسکرایا اور سگریٹ کا ہلکا سا کش لگا کر بولا۔''میرے خیال میں یہ زاویہ اس تکون کی صلیب ہے۔ بلکہ اگر میں زیادہ حقیقت پسندی سے کام لوں تو یہ کہوں گا کہ جوان اور گرم عورت کے ہوتے ہوئے بارش رات اور چائے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

''تو پھر کیا خیال ہے چائے منگواؤں یا جوان اور گرم عورت؟''

''جوان اور گرم عورت میری جیب میں ہے تم صرف چائے منگواؤ۔''

اتنا کہہ کر یاقوت نے اوورکوٹ کی اندرونی جیب میں سے نرگس کے تین زرد اور مرجھائے ہوئے سے پھولوں کا گلدستہ نکالا اور اسے سونگھ کر میز پر رکھ دیا۔

''یہ تو تین عورتیں ہیں یاقوت!''

''ہاں تین پھول ہیں۔''

''پھول باسی ہو کر زیادہ پیارا ہو جاتا ہے۔دیکھو!تم نے حسین عورت کو بہت کم اداس دیکھا ہو گا لیکن اداس عورت ہمیشہ پیاری لگتی ہے۔کیا ایسا نہیں ہے؟''

''طب کی رو سے اداسی اعصاب کی نقاہت اور پٹھوں کی تھکن کا نام ہے۔''

''میں تمہاری طب کو نہیں مانتا۔'' یاقوت نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

''لیکن یہ تو طب اکبر میں لکھا ہے بھائی۔''

''لکھا ہو گا۔۔۔۔۔۔۔چائے ابھی تک نہیں آئی بیرا چائے لاؤ۔''

''لایا جناب۔''

''اب ایک بات ہے۔یعنی میں تمہارے بازو پر ہاتھ پھیر کر بتا سکتا ہوں کہ یہ رگیں ہیں' یہ دریدیں ہیں اور یہ پٹھے ہیں۔''

یاقوت نے بات کاٹ کر کہا۔

''یہ سب الو کے پٹھے ہیں۔لو سگریٹ پیو۔''

اتنے میں چائے آ گئی اور تینوں دوست چائے پینے اور بارش وغیرہ کی باتیں کرنے لگے۔یاقوت کے ان دوستوں میں ایک حکیم ہے اور دوسرا ڈاک خانے کا کلرک دونوں دبلے اور اکہرے بدن کے ہیں۔حکیم ہوٹل کے پچھواڑے محلے کی ایک گلی میں طبابت کرتا ہے۔اس کی بوسیدہ میلی کچیلی دکان میں شربت اور دواؤں کی بوتلوں کی قطاریں لگی ہیں۔چھت سے جالے لٹک رہے ہیں۔ٹوٹے اور میل بھرے ڈھکنوں والے مرتبانوں میں پچھلے سے پچھلے برس کا گاجروں اور سیب کا مرتبہ پڑا ہے۔اس نے کسی باقاعدہ طبیہ کالج سے تعلیم نہیں پائی۔یونہی پڑھ پڑھا کر حکیم بن بیٹھا ہے۔سر کے درد سے لے کر انسانی بدن کے دقیق سے دقیق روگ کا علاج کرتا ہے۔عام طور پر سر درد والوں کو تو شفا ہو جاتی ہے اور مہلک بیماری والوں سے خوب پیسے بٹورنے کے بعد حکیم انہیں کسی ہسپتال میں داخل ہونے کا مشورہ دیتا ہے۔پہلی بیوی مر کھپ گئی ہے۔اس میں سے پانچ بچے ہیں۔دو برس سے محلے کے ایک غریب نانبائی کی سولہ سالہ بیٹی سے شادی کر رکھی ہے۔حکیم کی عمر پچاس کے قریب قریب ہے سر کے بال آدھے سے زیادہ سفید ہیں۔عینک کے پیچھے بے رنگ آنکھوں میں بہت گہری افسردگی اور بے رونقی رہتی ہے۔میلادی محفلوں میں سر پر عربی رومال باندھ کر بڑے خضوع وخشوع سے نعت خوانی بھی کرتا ہے۔نانبائی کی سولہ سالہ بیٹی داری کو اس نے ایک محفل میلاد میں ہی منڈھیر کے ساتھ لگی کھڑی دیکھا تھا کہ اس پر عاشق ہو گیا اور پیغام بھجوا کر شادی کر لی۔بگلہ مارکہ سگریٹ کی چھ سات ڈبیاں روزانہ پیتا ہے کیمیا گری میں بھی تھوڑا بہت دخل ہے لیکن سونا کبھی نہیں بنا سکا۔سردیوں میں ہر بار سنکھیا اور تانبا وغیرہ کے کشتے بنانے کی بھی کوشش کرتا رہتا ہے۔حکیم کا نام بڑا مشکل ہے اس لئے ہم صرف حکیم لکھنے پر ہی اکتفا کریں گے۔اپنی دکان کے اوپر ہی اک منزلہ تنگ سے مکان میں چھ بچوں اور نئی جوان بیوی داری کے ساتھ رہتا ہے۔

یاقوت کا دوسرا دوست جو ڈاک خانے میں کلرک ہے بڑا مرنجان مرنج اور بیوقوف سا آدمی اور سدا کا روگی ہے۔اسے ہر وقت کوئی نہ کوئی بیماری لگی رہتی ہے۔ایک بیماری جاتی ہے تو دوسری اس کی جگہ آن لیتی ہے۔حکیم سے اسی لئے اس کی دوستی ہے۔حکیم اس پر اپنی دواؤں کے تجربے کرتا رہتا ہے۔وہ حکیم کی دواؤں کی کسوٹی ہے چنانچہ اس کلرک کا رنگ بھی کسوٹی کی طرح کالا پڑ گیا ہے۔یہ اکہرے بدن کا پینتیس سالہ جوان ہے مگر بیماریوں اور حکیم کی دواؤں کی وجہ سے ادھیڑ عمر لگتا ہے۔پھر بھی حکیم کے مقابلے میں جوان دکھائی دیتا ہے۔اس کا نام غلام مصطفیٰ ہے۔حکیم اسے طوفا کہتا ہے۔ہم بھی اسے طوفا ہی کہیں گے۔طوفا

کلرک حکیم کے برابر والے مکان میں رہتا ہے۔ اس کا ابھی بیاہ نہیں ہوا۔ ماں بوڑھی ہے باپ ڈاک خانے کی نوکری سے ریٹائرڈ ہو چکا ہے اور ستر روپے پنشن پاتا ہے۔ طوفے کی تنخواہ ایک سو تیس روپے ہے۔ دو بہنیں جوان ہو چکی ہیں۔ ابھی ان دونوں کی شادی کرنی ہے۔ طوفے کی دوسری بیماریوں میں یہ دو بیماریاں بھی شامل ہیں۔ لیکن ان دونوں بیماریوں کا علاج حکیم کے پاس نہیں ہے۔ طوفے کا سر بیچ میں سے گنجا ہو رہا ہے۔ اسے اپنے گنجے پن کا بھی شدید احساس ہے۔ وہ ہر ہفتے حکیم کا تجویز کردہ کوئی نہ کوئی نیا لیپ سر پر لگاتا ہے۔ نئی معجون کھاتا ہے مگر بال برابر جھڑتے جاتے ہیں۔

یاقوت' حکیم اور طوفا کلرک۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تینوں امرتسر کے دوست ہیں۔ یہ امرتسر شہر کے ایک ہی محلے میں رہا کرتے تھے۔ پاکستان میں آ کر حکیم اور طوفا تو میکلوڈ روڈ کے پچھواڑے ایک گلی میں آباد ہو گئے اور یاقوت ان سے بچھڑ گیا۔ وہ لاہور سے کوئی تیس میل دور ایک قصبے میں جا کر آباد ہو گیا۔ امرتسر میں یاقوت کے والد کے پاس پھلوں کے اپنے چھ سات باغ تھے اور وہ میوہ منڈی میں آڑھت کا دھندا کرتا تھا۔ یاقوت ان دنوں کالج میں پڑھا کرتا تھا۔ اس کا بچپن پھلدار باغوں میں رکھوالوں کے ساتھ نہروں میں چھلانگیں لگاتے اور خالی پنجرے ہاتھ میں لئے بجروں کی تلاش میں کچے راستوں پر خاک اڑاتے گزرا تھا۔ وہ نیچر کا ہم نشیں تھا۔ اس ہم نشینی نے اسے فطرت کا ہم سخن بنا دیا۔ وہ شعر کہنے لگا لیکن اس کے اشعار بحر سے خارج بے وزن ہوتے وہ نثر کی چار چھ سطروں میں ایک خوبصورت شعر کہہ دیتا۔ ایک دل پر اثر کرنے والی بات کر دیتا۔ دوسرے شاعر اس کا مذاق اڑاتے اس کے نثر کے شعروں پر پھبتیاں کستے مگر وہ اپنی زبان اور اپنے انداز میں شعر کہتا رہا۔ وہ فطرت کے مظاہر کا پرستار تھا پھول' کھیت' چاند ستارے' ندی نالے' پھلوں سے لدے ہوئے درخت' جاڑے کی ٹھٹھرتی صبح میں طلوع ہوتا ہوا سرخ سورج اور اپنی پنکھڑیوں پر شبنم کے موتی لئے ہوئے مہک اڑاتے پھول اور گہرے نیلے آسمان پر چمکیلی دھوپ میں چکر کاٹتے ہوئے سفید و براق کبوتر اور بیریوں کے گنجان درختوں میں شام کے غمگین اندھیروں میں بولتی چڑیاں اسے مسحور کر دیا کرتیں۔ وہ ورڈز ورتھ یا ٹینی سن کی کتاب لے کر گھنٹوں امرود ناشپاتی اور آم کے باغوں میں گم سم بیٹھا رہتا۔ کبھی کتاب میں سے اشعار پڑھتا اور کبھی منہ اٹھا کر درختوں میں چہچہانے والے پرندوں کی میٹھی بولیاں سنتا سردیوں کی صبحوں کو وہ اوس میں بھیگی ہوئی ناشپاتی کی سیاہ ٹہنیوں پر اٹکے ہوئے خزاں زدہ سرخ پتوار پر جھک کر انہیں غور سے دیکھتا۔ ٹھنڈی ٹہنیوں پر سے اوس کی بوندیں انگلی پر لے کر اپنی آنکھوں پر لگاتا۔ گرم ہونٹوں پر لگاتا۔ کبھی ہونٹ ٹہنیوں پر رکھ دیتا اور آنکھیں بند کر لیتا۔ ناشپاتی کی گیلی ٹہنیوں کی تازہ اور ٹھنڈی مہک اس کے نتھنوں سے ہو کر خون میں گھل مل جاتی اور اسے یوں لگتا جیسے

وہ ایک اوس میں بھیگی ہوئی سنہری ناشپاتی ہے جو اپنی ٹہنی سے لگی ہے وہ منہ اندھیرے کمپنی باغ میں جا کر وادی کے صد برگ شبنم میں بھرے ہوئے پھولوں پر منہ رکھ کر زور سے سانس کھینچتا۔ اوس میں رچی ہوئی خوشبو کی ایک کہکشاں سی اس کے جسم میں پھیل جاتی اور اسے اپنے خون کے ہر قطرے میں گل وادی کے ہزاروں شگوفے پھوٹتے محسوس ہوتے۔ اسے سردیوں میں ٹھنڈے پھولوں پر منہ رکھ دینے سے اور اوپر کو سانس کھینچنے سے کبھی زکام نہیں ہوا تھا پو ماگھ کے مہنوں میں جب غضب کا پالا پڑتا اور بارشیں ہوتی تو وہ سر پر کمبل ڈال کر تاہلیوں ''شیشم'' کے نیچے نیچے چلتا ہوا بڑی نہر پر پہنچ جاتا۔ راستے میں کسی کچے کوٹھے کے اندر سے اسے دیہاتی لڑکیوں کے گانے کی آواز آتی۔

ہیرنی او ہیرنی

ہیرنی جھنڈیاں لمیاں

اور بیساکھ میں جب گندم پک کر تیار ہو جاتی تو دھوپ میں اس کے سنہری خوشے ذرا سی ہوا میں بھی جھومنے لگتے تھے۔ پھر وہ ڈھول تاشوں کی تیز لے کے ساتھ ساتھ کسانوں کو گندم کاٹتے دیکھتا۔ فصل کٹ جانے کے بعد وہ ان غریب عورتوں کو بھی دیکھتا جو کٹے ہوئے کھیت میں گھوم پھر کر گندم کے گرے پڑے خوشے اٹھا اٹھا کر اپنے جھولوں میں ڈالتی جاتیں۔ ان میں سے اکثر ننگے پاؤں ہوتیں اور ان کے پیر لہولہان ہو جایا کرتے (کیونکہ جب گندم کا پودا کاٹ دیا جاتا ہے تو اس کی جڑیں کانٹوں کی طرح اوپر کو اٹھی ہوتی ہیں) برسات میں وہ گلیوں میں ننگ دھڑنگ دوستوں کے ساتھ نہاتا پھرتا اور باغوں میں جا کر گرے پڑے جامن اٹھاتا اور درختوں پر چڑھ کر امرود توڑتا۔ مئی جون کی تیز دھوپ والی جھلساتی دوپہروں میں وہ اپنے ہم جولیوں کے ساتھ نہر کے پل پر سے چھلانگیں لگایا کرتا اور جب آندھی آتی تو اس کے فوراً بعد باغوں میں آ کر زمین پر گری پڑی کچی امبیاں جھولی میں جمع کرتا اور گھر آ کر نمک مرچ لگا کر مزے سے کھاتا۔ جب باغبا نگلابی رنگ کے سچے گلاب کے کھیتوں میں گھس کر پھول توڑ توڑ کر اس کے بڑے بڑے گٹھڑ باندھ کر گڈوں پر لاد کر روانہ ہوتے تو وہ بھی کتنی دور تک ان کے پیچھے پیچھے چلتا چلا جاتا۔ دل میں یہ سوال لئے کہ یہ لوگ اتنے سارے پھولوں کو اس بے دردی سے گٹھڑوں میں باندھ کر کہاں اور کیوں لے جاتے ہیں۔ جب وہ بڑا ہوا تو اسے پتہ چلا کہ وہ لوگ گلاب کے ان پھولوں کو گلقند بنانے کے لئے لے جایا کرتے ہیں۔

جب وہ بڑا ہوا تو اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ فطرت نے صرف پھول پودے ہی نہیں پیدا کئے بلکہ کچھ قوانین بھی بنائے ہیں۔ کچھ ناقابل شکست اٹل اصول بھی وضع کئے ہیں۔ پھر اس نے انسان کی جبلت میں کچھ اٹل اصولوں کو کارفرما دیکھا اور ان جبلی اصولوں کو

فطری اصولوں کے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا۔ اس نے ان دونوں اصولوں کے ہم رکاب چکر کو شروع سے لے کر آخر تک گھومتے بڑے غور سے دیکھا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر جب آنکھیں کھول کر اس نے گلاب کے پھول کو سونگھا تو اسے خوشبو کے احساس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ خوشبو فطرت کے کس اصول کے تحت پیدا ہو رہی ہے وہ پھول کا اور فطرت کا پہلے سے زیادہ گرویدہ ہو گیا۔ ان دنوں وہ امرتسر کے ایک کالج میں بی اے میں پڑھ رہا تھا۔ اس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ میز پر سے کتابیں اٹھا کر الماری میں بند کیں۔ فطرت کے اصول محترمہ فطرت صاحبہ کے ہاتھوں میں تھمائے' جبلی اصول جبلت بی بی کی جھولی میں رکھے اور خود ماتھے پر تلک لگا کر نرگس کا زرد پھول ہاتھ میں لیا اور امرتسر سے ریل میں سوار ہو کر سیدھا بنارس پہنچ گیا۔

بنارس میں اس نے کبیر کے دوہوں کی بازگشت سنی۔ اس نے وہ پر پیچ گلیاں دیکھیں جہاں ننگے پاؤں گھوم پھر کر کبیر جی نے لوگوں کو محبت اور امن کا درس دیا تھا۔

وہ لوگ دیکھے جن کے آباؤ اجداد نے کبیر کو اپنی آنکھوں کے سامنے سوت لے کر گھر سے بازار اور بازار سے گھر جاتے دیکھا تھا۔ اسے چوک میں کھڑے ہو کر اپنے آفاق گیر دانائی سے بھرپور دوہے گاتے سنا تھا۔ وہ دو ماہ بنارس میں رہا اور وہاں سے بھگت کبیر کا یہ دوہا گاتا دلی آ گیا۔

نینن   بھرے   تمری   اور
کیوں   لیو   مکھ   مور   سجنوا

دلی میں وہ تیار پور میں اپنے ایک بنگالی دوست کے کوارٹر میں آن رہا۔ سوچیتا۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تھا اس لڑکے کی چھوٹی بہن کا نام۔۔۔۔۔۔۔ نرم و نازک سوگواری لڑکی۔۔۔۔۔۔۔ منہ اندھیرے اٹھ کر اشنان کرتی اور اپنی ماتا کے ساتھ چوکی پر بیٹھ کر درگاہ دیوی کے بھجن گایا کرتی تھی۔ تھالی میں لوبان سلگ رہا ہوتا۔ چوکھی میں تیل بھری بتیاں بڑی پرسکون لو دے رہی تھیں۔ سوچیتا کی آنکھیں بند ہوتیں۔ کالے بال کندھے پر بکھرے ہوئے اور وہ اپنی غمگین آواز میں بنگال زبان کا بھجن گا رہی ہوتی تھی۔ یاقوت دن بھر دلی کے گلی کوچوں میں اوراق مصور کی ورق گردانی کرتا' شہر سے باہر اجاڑ فصیلوں' ویران کھنڈروں اور آباد و روشن درگاہوں کی طرف نکل جاتا۔ درگاہوں میں وہ سر پر رومال باندھ کر بیٹھ جاتا۔ اگربتیوں کی مہک میں آنکھیں بند کر کے وہ تلاوت کلام پاک کرتا۔ قوالیاں سنتا۔ مجاوروں کو سب کی آنکھیں بچا کر نیاز کے پھل اور مٹھائیاں اپنے گھروں کو بھجواتے دیکھتا۔ لوگوں کو درگاہ کی جالیوں کے ساتھ منہ لگا کر روتے اور ماتھے رگڑتے دیکھتا۔ قبروں کو سجدے کرتے دیکھتا اور خاموش بیٹھا سوچتا رہتا۔ فطرت اور جبلت اور مذہب

کے تانے بانے جوڑنے کی کوشش کیا کرتا وہ کھنڈروں میں جا کر ان چبوتروں پر گلہریوں کو بھاگتے دوڑتے دیکھتا جہاں کل تک بادشاہ اپنا تخت سجا کر دربار کیا کرتے تھے۔ وہ ان فصیلوں کو دیکھتا جو منہدم ہو چکی تھیں اور جہاں گھاس پھونس اگ آئی تھی اور جہاں کل تک بابر بادشاہ دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر دوڑ لگایا کرتا تھا۔ اس نے بادشاہوں کی بیگمات کے ان حرم سراؤں میں چڑیوں کے گھونسلے دیکھے جہاں کل تک کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔

شام کو تھک ہار کر وہ کناٹ پیلس کے کافی ہاؤس میں آ کر بیٹھ جاتا اور وہاں کے شاعروں' ادیبوں اور نقادوں کے ساتھ ادب اور فلسفہ پر تبادلہ خیالات کرتا۔ جب دلی کے قبرستانوں' کھنڈروں' ویرانوں اور حرم سراؤں سے اس کا دل بھر گیا تو اس نے بنگالی دوست کی ماتا کو پرنام کیا۔ اپنے دوست کو گلے لگایا۔ سویتا کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا اور دلی سٹیشن سے ایک مسافر گاڑی پکڑی اور جے پور چلا گیا۔ یہاں وہ میرا بائی سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس بیراگن راجپوت شہزادی کے درشن کرنا چاہتا تھا جس نے اپنے خاوند کا بھجوایا ہوا زہر کا پیالہ ہنس کر پی لیا تھا۔ جس نے ایک شخصیت کی محبت میں بھجن کو شعریت کے انتہائی بلند مقام پر پہنچا دیا تھا اور جس نے اکتارے پر گاتے گاتے کہا تھا۔

میں کنج گلی کی کوئل ہوں

اور کرشن میں بول رہی

اس نے گھنے ساکھوں کے ہاتھی چھپواں گھاسوں والے اندھیارے جنگل دیکھے جہاں ٹھنڈے پتھروں کے بیچوں بیچ چشمے ابلتے تھے اور حبس آلود پہروں میں کالے ناگ آرام کرتے تھے۔

جے پور سے وہ مدراس گیا۔ مدراس میں دو ماہ رہنے اور سرخ مرچوں کے ساتھ موٹے چاول کھانے اور نیچی چھتوں والے گھٹے گھٹے مندروں میں رامیشورم کی سندر کنواری ناریوں کو بھارت ناٹیم کے نرت بھاؤ بدلتے اور مردنگ مجیروں کے ساتھ کرناٹکی سنگیت کی تڑپ تڑپ کر مچلتی سروں کے تال پر رقص کے شعلے اڑاتے دیکھنے کے بعد اس نے کولمبو کی راہ لی۔ کولمبو میں اس نے بھگوان بدھ کے مندر میں بھکشوؤں اور بھکشنیوں کو عود و عنبر کے دھوئیں میں ساکیہ منی کے بیراگی شہزادے کے بت کے سامنے رتنا گری کے سفید پھولوں کے ہار رکھتے دیکھا اور ماؤنٹ لیونیا کے بیچ پر ناریل کے درختوں کے نیچے ولندیزی اور انگریز عورتوں کو نیم عریاں لباس میں نہاتے بھی دیکھا اور ٹمپل روڈ کے عقب والی گلیوں میں سنہالی غریب عورتوں کو دو وقت روٹی کی خاطر اپنا جسم بیچتے بھی دیکھا۔

کولمبو سے وہ ایک بحری جہاز میں سوار ہو کر سیدھا کلکتے آ گیا۔ یہ کسی ہندوستانی کمپنی کا بحری جہاز تھا جو چھوٹا سا اور بڑا تھا۔ سب

سے نچلی منزل میں سیلن تھی اور گلے سڑے پیازوں کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ کینٹین والا ننگے بدن' پسینے میں بیٹھا ایک آنے میں جلی ہوئی مدراسی کافی کے گلاس بھر بھر کر دیے رہا تھا۔ کافی میں سے مٹی کے تیل کی بو آ رہی تھی۔ رات کو ڈیک پر ایک خلاصی پھرا کرتا جو سوئے ہوئے مسافروں کا سامان چوری کر لیا کرتا۔ بیچ سمندر میں پہنچ کر لہریں ذرا طوفانی ہوئیں تو یہ چھوٹا سا جہاز بری طرح ڈولنے لگا۔ مسافروں کا مارے چکروں کے برا حال ہو گیا۔ یاقوت دو روز متواتر سرہانے کے نیچے سر دبا کر پڑا رہا کلکتے کی جیٹی آئی تو لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

یاقوت چھ ماہ تک کلکتے میں پڑا رہا۔ یہاں اس نے خضر پور جیٹی پر نوکری کر لی۔ دوسرے ہی ماہ نوکری سے اس کا دل اکتا گیا۔ اس کے پاس اب روپے ختم ہو گئے تھے۔ وہ گھر سے کوئی پانچ ہزار روپے کی رقم چرا کر نکلا تھا۔ یہ رقم اب ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک اخبار کے دفتر میں بطور پروف ریڈر ملازم ہو گیا۔ رات میں کسی وقت وہ دو تین گھنٹوں کے لئے وہاں جاتا اور باقی سارا دن وہ کلکتے کے بازاروں میں مٹر گشت کیا کرتا۔ یہاں اس نے ایک بنگالی لڑکی سے عشق بھی کیا۔ اس لڑکی کو ساتھ لے کر ہوٹلوں اور باغوں میں بھی پھرا۔ چونکہ یاقوت مسلمان تھا اور بنگالن ہندو تھی اس لئے یہ عشق پروان نہ چڑھ سکا اور منزل کے قریب پہنچ کر سارے رشتے درہم برہم ہو گئے۔ وہ لڑکی ایک کباڑیئے کی بیٹی تھی یاقوت کو ٹیگور کے بنگالی گیت اور اپنی ماتا پتا کے جھگڑے سنایا کرتی تھی یاقوت یہ دونوں چیزیں بڑے غور سے سنا کرتا۔ آخر ایک روز پنجاب کی یاد نے جوش مارا۔ یاقوت کے دل میں مکی کی روٹی' سرسوں کے ساگ اور لسی کی یاد تڑپ اٹھی اور وہ ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو کر واپس امرتسر کو چل پڑا۔

گھر والے اسے گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر سوائے والد صاحب کے خوش ہوئے یاقوت نے جن جن شہروں کی سیر کی تھی وہاں اس نے بڑے خوبصورت نثریہ شعر کہے تھے۔ یاقوت نے یہ سارے اشعار اپنی ڈائری میں نقل کر لئے۔ اس نے دوبار کالج میں داخلہ لے لیا اور بی اے پاس کر لیا۔ اس اثنا میں ہندوستان مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے۔ اور پاکستان کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا تھا۔ آخر پاکستان بن گیا اور پنجاب سے وسیع پیمانے پر آبادیوں کا انخلا شروع ہو گیا۔ یاقوت جس قافلے کے ساتھ امرتسر سے براستہ چھ ہرٹہ پاکستان کی طرف چلا اس پر سکھوں اور ہندوؤں نے حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ یاقوت کے والد اور بڑے بھائی شہید ہو گئے۔ پاکستان پہنچ کر یاقوت کی والدہ اسی غم میں شدید بیمار ہو گئی اور دو مہینے بعد وفات پا گئی۔ یاقوت نے لاہور سے تیس میل دور قصبہ اسلام پور میں باغات الاٹ کروا لئے اور اپنی دو بہنوں کو راولپنڈی میں بیاہ دیا۔ چھوٹے بھائیوں میں سے ایک تو گوجرانوالہ کالج میں داخل ہو گیا اور دوسرے نے باغات اور پھلوں کی آڑھت کا کام سنبھال لیا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے شادی کر

لی۔اس کی بیوی امرتسر کے کشمیری خاندان کی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔وہ لاہور سے بیاہی گئی مگر قصبے میں آ کر اس نے یاقوت کے چھوٹے بھائی اکبر کے گھر کو جنت کا نمونہ بنادیا۔پھلوں کے باغات کی آمدنی میں تینوں بھائیوں کا حصہ تھا۔لیکن اکبر بڑا کاروباری قسم کا آدمی تھا۔اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ یاقوت دنیادار آدمی نہیں ہے اور وہ حساب کتاب کے چکر میں کبھی نہیں پڑ سکتا چنانچہ وہ ہر سال یاقوت کو اس کے حصے کی نصف رقم دیا کرتا اور باقی ادھر ادھر کے جعلی کھاتوں میں ڈال دیا کرتا۔یاقوت کو اس بد دیانتی کا بخوبی علم تھا۔ مگر وہ جان بوجھ کر خاموش تھا۔وہ چھوٹے بھائی کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا اور پھر اسے زیادہ پیسوں کی ضرورت بھی نہیں تھی۔اسلام پور میں اس نے ناشپاتیوں کے باغ میں اپنا ایک چھوٹا سا دو کمروں والا کاٹج سا بنا رکھا تھا اسی کاٹج میں وہ رہتا تھا۔دن بھر وہ قصبے کے کھیتوں میں لمبی لمبی سیریں کرتا۔کبھی قصبے کے سکول کے ہیڈ ماسٹر کے ہاں اور کبھی پٹواری کے پاس جا کر بیٹھ جاتا۔کچھ وقت باغ کے رکھوالوں کے پاس بھی گزارتا۔ان کی پھونس کی جھونپڑی کے باہر تخت پوش پر بیٹھ کر ان سے پھلوں کی فصل' منڈی کے بھاؤ اور ان کے بال بچوں کی خیریت کے بارے میں گفتگو کرتا اور رات کو اپنے کاٹیج میں آ جاتا اور دیر تک مطالعے میں محو رہتا۔دوپہر اور رات کا کھانا وہ اپنی بھابی کے ہاں جا کر کھاتا۔اس کی بھابی کا گھر۔۔۔۔۔۔۔یعنی یاقوت کا پرانا گھر قصبے کے وسط میں تھا اور قصبے کا سب سے پختہ اور اونچا لمبا مکان تھا۔محلے بھر میں اس گھرانے کی بڑی ساکھ تھی اور لوگ اس کنبے کے افراد کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

ساتھ والے محلے میں فیروز پور کے ایک ریٹائرڈ سٹیشن ماسٹر کا خاندان آباد تھا۔ان لوگوں نے اسلام پور کے قریب وجوار میں کچھ زمین الاٹ کروائی تھی اور بڑی خوشحالی اور سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ان لوگوں کا یاقوت کے ہاں اکثر آنا جانا تھا اور دونوں گھرانوں کے آپس میں بڑے اچھے تعلقات تھے۔سٹیشن ماسٹر کی سب سے چھوٹی لڑکی نجمہ کے بال سنہری اور رنگت گوری تھی۔ آنکھیں نسواری رنگ کی تھیں اور رخسار پر بائیں جانب ہونٹوں کے پاس ایک سیاہ تل تھا۔ظاہر ہے ایسی لڑکی کو ہم حسین کہے بغیر نہیں رہ سکتے۔اس کی عمر بھی اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔نجمہ قصبے کے گرلز ہائی سکول میں دسویں جماعت میں پڑھتی تھی یاقوت نجمہ سے پیار کرتا تھا اور اس نے نجمہ کی خوبصورتی اور معصوم جوانی کے بارے میں کتنے ہی نثریہ اشعار کہہ کر اپنی ڈائری میں لکھ رکھے تھے۔لیکن اس نے اپنی محبت کا نجمہ کے سامنے کبھی اظہار نہیں کیا تھا نجمہ کو بھی یاقوت کی محبت کا پورا احساس تھا مگر وہ خاموش تھی۔ہمارے ہاں لڑکیاں مرد کے اظہار محبت پر بھی خاموش رہتی ہیں۔چہ جائیکہ وہ خود اظہار محبت کریں!یہی وجہ تھی کہ نجمہ ہمیشہ یاقوت کے سامنے آتے گھبرا جاتی تھی اور جب کبھی آمنا سامنا ہو جاتا تو شرم سے نظریں نیچی کر لیتی اور کترا کے نکل جاتی۔

ایک روز نجمہ یاقوت کی بھابی سے مل کر نیچے اتر رہی تھی کہ سیڑھیوں میں یاقوت سے آمنا سامنا ہو گیا۔نجمہ نے جلدی سے نقاب

الٹ دیا اور گھبرا گئی۔ اب ہوا یہ کہ راستہ دینے کے لئے جس طرف یاقوت ہٹتا ادھر کو ہی نجمہ بھی ہٹ جاتی۔ چوتھی بار جب ایسا ہوا تو دونوں کی ٹکر ہو گئی۔ نجمہ کے منہ سے ایک ہلکی سی، چھوٹی سی، بڑی پر اسرار چیخ نکل گئی وہ بڑی تیزی سے نیچے اتر کر سیڑھیوں میں غائب ہو گئی۔ یاقوت ایک پل کے لئے وہیں کھڑا رہا۔ نجمہ کا کندھا یاقوت کے سینے سے چھو گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے سینے میں آگ بھر گیا ہے۔ اس نے شہر شہر کی خاک چھانی تھی۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا۔ عجیب عجیب قسم کی خوبصورت لڑکیوں کو دیکھا تھا۔ ان سے پیار کیا تھا مگر یہ اسے ایک حیرت انگیز جذباتی تجربہ ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ دنیا جہان کی لڑکیوں کا حسن اور حیا نجمہ کے وجود میں سمٹ آئی ہے ساری کائنات کے سورج اس ایک سورج میں داخل ہو کر گردش کر رہے ہیں۔ دنیا بھر کے پھول اس ایک پھول کے اندر مسکرا رہے ہیں۔

اس رات یاقوت نے نجمہ کو ایک طویل محبت بھرا خط لکھا۔ اس خط میں اس نے اپنی قلبی واردات کو شروع سے لے کر آخر تک بیان کر دیا۔ یہ خط گیارہ صفحات پر مشتمل تھا۔ ہر صفحے پر یاقوت نے واٹر کلر سے نرگس کے خوبصورت پھول بنائے۔ ہر سطر پر اس نے حنا کے عطر کے قطرے گرائے۔ محبت نامے کو اس نے پھولوں اور عطر کی خوشبوؤں میں بسا کر لفافے میں بند کیا اور ایک کتاب میں رکھ کر نجمہ کے سکول سے کوئی فرلانگ کے فاصلے پر آم کے درخت کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ نجمہ چھٹی کے بعد وہاں سے گزرا کرتی ہے۔ اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بجی۔ یاقوت کا دل دھڑکنے لگا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد اسے دور سے سرسوں کے کھیتوں کے بیچوں بیچ نجمہ اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ کتاب میں رکھا ہوا خط خوشبو اڑا رہا تھا۔ جب وہ اس کے قریب سے گزرنے لگی تو یاقوت درخت کی اوٹ میں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ نجمہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ یاقوت نے کتاب اس کی طرف بڑھائی۔

''یہ کتاب میں تمہارے لئے لایا تھا نجمہ۔''

نجمہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک پل کے لئے بالکل بت بنی کھڑی رہی۔ یاقوت کا کتاب والا ہاتھ نجمہ کی طرف بڑھا ہوا تھا اور حنا کے عطر کی خوشبو اڑ رہی تھی۔ اس خوشبو نے ان دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ خوشبو کی چاندنی میں وہ دونوں بھیگے ہوئے تھے اور ان کے چاروں طرف گہرا سناٹا تھا اور آم کی ٹہنی پر بیٹھا ہوا طوطا گردن جھکائے ان کی طرف بت بنا دیکھ رہا تھا۔

''یہ کتاب میں تمہارے لئے لایا ہوں نجمہ۔''

یاقوت کے اس جملے کو جیسے آم کے درخت کا ایک ایک پتا دہرانے لگا۔ یہ کتاب میں تمہارے لئے لایا ہوں نجمہ۔۔۔۔۔۔۔۔ ! یہ کتاب میں تمہارے لئے لایا ہوں نجمہ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کتاب کو تھام لو نجمہ! اس کے ایک ایک صفحے پر

سینکڑوں بار تمہارا نام لکھا ہے۔ اور تمہارے ہر نام میں کسی کا دھل دھڑک رہا ہے اور یہ خط حنا کے عطر کی شیشی میں قلم ڈبو کر لکھا گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔مت لو۔۔۔۔۔۔۔۔مت لو نجمہ۔۔۔۔۔۔۔۔اس کتاب کے ہر ورق پر تمہاری بدنامی کی مہر ہے۔ اس کے کھلتے ہی گناہ کے چھلاوے نکل بھاگیں گے اور پھر کبھی تمہارے قابو میں نہ آئیں گے۔ تم ہزار کوشش کرو گی وہ تمہاری گرفت میں نہ آئیں گے۔ یہ کتاب تمہارے دکھوں کا حروف اول ہے۔ تمہاری پریشانیوں کا پہلا دروازہ ہے۔ اسے مت کھولو! اسے مت کھولو! پچھتاؤ گی۔۔۔۔۔۔۔۔پچھتاؤ گی۔۔۔۔۔۔۔۔آم کی ٹہنی پر بیٹھا ہوا طوطا حیران وساکن تھا۔ محبت کرنے والوں کو کیا ہو گیا ہے؟ کیا انسان محبت کرتے ہوئے بھی ڈرنے لگا ہے؟ نجمہ نے برقعے میں سے اپنا نازک سرخ وسپید ہاتھ نکال کر یاقوت کے ہاتھ سے کتاب تھام لی اور آگے چل پڑی۔

طوطا خوشی سے شور مچاتا اڑ گیا۔ ہوا میں ٹہنی کے پتے جھومنے لگے اور حنا کے عطر کی خوشبو نجمہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے کتاب نہیں بلکہ اگربتیوں کا مٹھا سلگا کر برقعے کے اندر کر لیا ہے۔ اس کے برقعے میں عطر کی تیز مہک پھیل گئی تھی۔ گھر جا کر اس کو سب سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ گھر والے خوشبو کا سراغ پا کر کتاب تک نہ پہنچ جائیں جس کے اندر رکھا ہوا محبت نامہ نجمہ نے دیکھ لیا تھا۔ اس نے کتاب کو اپنی الماری میں دوسری کتابوں کے نیچے دبا کر رکھ دیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد کمرہ بند کر کے نجمہ نے یاقوت کا طویل اور خوبصورت محبت بھرا خط پڑھا۔ خط پڑھتے پڑھتے اس پر ایک نشہ طاری ہو گیا۔ وہ محبت کی ان وادیوں میں پہنچ گئی جہاں قدم قدم پر ایسے پھول کھل رہے تھے جن کے چہرے وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی اور جن کی خوشبو وہ پہلی بار سونگھ رہی تھی۔ اسے یوں لگا گویا اس کے ہاتھ میں خط نہیں بلکہ کیلے کا چوڑا پتا رکھا ہے جس میں گلاب گیندا' مولسری' چنبیلی اور موتیے کے خوشبودار پھول پڑے ہیں۔ فرط مسرت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور دل دھڑکنے لگا۔ اس باغبان کی طرح جو اپنی پھلواری کو پہلی بار پورے جوبن پر دیکھتا ہے۔

نجمہ نے یاقوت کے محبت نامے کا جواب بڑا مختصر مگر دل کی گہرائیوں سے دیا۔ اس نے اپنی محبت کا اعتراف تو نہ کیا لیکن یاقوت کے خط کا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ اسے خط پڑھ کر بے اندازہ خوشی ہوئی ہے ایک طرح سے یہ محبت کا بھرپور اظہار تھا۔ یاقوت کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چمک اٹھے۔ وہ نجمہ پر دل وجان سے فریفتہ تھا اور سوچتا تھا کہ اگر نجمہ نے اس کی محبت کا جواب نفرت سے یا بے اعتنائی سے دیا تو دنیا کے گھپ اندھیرے میں کس امید کے دیے کی روشنی میں زندگی بسر کرے گا؟ نجمہ نے محبت کا جواب محبت

سے دیا تھا۔ یاقوت کو زندگی بسر کرنے کا جواز مل گیا تھا اس کے سامنے تمام پر پیچ راستے جگمگا اٹھے تھے۔ ہر چوراہے میں ایک سورج چمک رہا تھا اور ہر گلی کے موڑ پر ایک چاند طلوع ہو رہا تھا۔ یاقوت روشنی کا ایک ذرہ بن کر اپنے سورج کے گرد اپنی نجمہ کے گرد گردش کرنے لگا تھا۔ سنہری بال' سیاہ تل' اور نسواری آنکھیں۔۔۔۔۔۔۔۔کائنات کے یہ تین ہی زاویے تھے جنھوں نے اپنی بانہیں یاقوت کے گلے میں ڈال دی تھیں اور وہ اس ازلی اور ابدی تکون کے تخت پر بیٹھا خوشبو' رنگ اور نور کے ملگجی بادلوں میں رواں دواں تھا۔

نجمہ اور یاقوت کی محبت بھری خط و کتابت شروع ہوگئی نجمہ نے چوتھے ہی خط میں اپنی محبت کا اعتراف کر لیا۔ وہ یاقوت کے خط اپنی الماری میں چھپا کر رکھتی تھی اب اس الماری میں سے ہر وقت حنا کے عطر کی مہک آنے لگی۔ اس خیال سے کہ گھر میں کسی کو شک نہ ہو جائے نجمہ نے اپنے کپڑوں میں بھی حنا کا عطر لگانا شروع کر دیا۔ وہ پہلے سے بڑھ چڑھ کر بڑھ جوش و خروش سے پڑھنے اور گھر کا کام کاج کرنے لگی تھی۔ اسے معمولی سے معمولی کام میں بھی بڑا لطف آتا۔ محبت بہت بڑی طاقت ہے۔ یہ مردہ رگوں میں بھی زندگی کا گرم خون دوڑا دیتی ہے۔

(نجمہ کے پاس ایک بڑا خوبصورت ٹین کا رنگین ڈبہ تھا۔ جو اسے اس کی ایک سہیلی نے دیا تھا۔ اس ڈبے پر گلاب کے ڈھیر سارے سرخ سفید پھول بنے تھے وہ یاقوت کے محبت نامے اسی ڈبے میں جمع کئے جاتی۔ وہ خط کے اوپر گلاب کی پنکھڑیوں کی تہہ بچھا دیتی۔ اس ڈبے کی چابی ہمیشہ نجمہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ یاقوت نے نجمہ کے محبت ناموں کے لئے اخروٹ کی لکڑی کی ایک منقش صندوقچی خرید لی تھی اور اس میں پھولوں کی تہہ لگا کر وہ نجمہ کے خط جمع کرتا۔)

آپس میں خطوط کا تبادلہ ایک ننھے مقاصد کے ذریعے ہوتا جو یاقوت کے چھوٹے بھائی اکبر کا بیٹا تھا۔ اس ننھے قاصد کو دونوں طرف سے کھانے کو خوب مٹھائی وغیرہ ملا کرتی اور وہ خوشی خوشی ایک کا خط دوسرے تک پہنچا دیا کرتا۔ ہفتے میں دو ایک بار ان دونوں کی ملاقات بھی ہو جاتی۔ کبھی سکول سے آتے جاتے اور کبھی مکان کی سیڑھیوں پر چھوٹے سے قصبے میں چونکہ بدنامی کا زیادہ خدشہ تھا اس لئے وہ دونوں ملنے جلنے میں بڑے محتاط رہا کرتے۔ جتنی دیر کے لئے بھی وہ ملتے آپس میں خوب پیار اور محبت کرتے۔ وقت کے بے درد ہاتھوں سے ملاپ کو جو چند ایک گھڑیاں بھی انہیں میسر آتیں وہ ان کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے۔ فائدہ ان معنوں میں کہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے۔ ایک دوسرے کے چہرے کو محبت کی چھلکتی ہوئی نظروں سے دیکھتے۔ گہرے گہرے سانس لیتے۔ کبھی جدا نہ ہونے کے عہد و پیمان باندھتے ایک دوسرے کے سینے سے لگ کر تھوڑے بہت آنسو بہاتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے جدا ہو جاتے۔

عید کے روز یاقوت نے نجمہ کو ریشمی قمیض اور فاؤنٹن پن کا تحفہ دیا۔ نجمہ نے اسے ریشمی رومالوں کا سیٹ اور حنا کے عطر کی شیشی بھیجی۔ نجمہ دوپہر کو خوب بن سنور کر تھوڑی دیر کے لئے یاقوت کے ہاں آئی۔ اس نے پیازی رنگ کی پھولدار قمیض اور ساٹن کی سفید شلوار پہن رکھی تھی۔ کانوں میں سونے کے بندے چمک رہے تھے۔ بالوں میں نقرئی لڑیاں جھلملا رہی تھیں۔ دوپٹے پر گوٹہ لگا تھا۔ مٹھی میں عطر بھرا رومال تھا۔ نسواری آنکھوں میں عید ملن کی مسرتیں تھیں۔ چہرہ مسکرا رہا تھا۔ رخسار کا تل باتیں کر رہا تھا۔ وہ دلہنوں سے بھی بڑھ چڑھ کر حسین دکھائی دے رہی تھی۔ یاقوت نے اسے دیکھا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ بھابی نجمہ سے سویوں کی پلیٹ لے رہی تھی اور نجمہ کہہ رہی تھی:

''امی جان نے آپ کو سلام اور عید مبارک کہی تھی۔''

''خیر مبارک۔۔۔۔۔۔۔۔امی کو میری طرف سے بھی عید مبارک کہنا۔''

جب نجمہ سیڑھیاں اترنے لگی تو یاقوت سب سے آخری سیڑھی پر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگ گئے۔ نجمہ کے کپڑوں سے خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔

''تم حنا کی شہزادی ہو نجمہ۔''

نجمہ نے کچھ مسکرا کر' کچھ شرما کر نظریں جھکالیں اور ہاتھ اٹھا کر سر پر سے کھسکا ہوا دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔ اس کی چوڑیاں بج اٹھیں۔

''اس جھنکار میں پوری کائنات کی موسیقی ہے نجمہ! تم خوشبو اور موسیقی ہو۔ پھول اور ساز ہو۔ جس روز تم دلہن بن کر میرے گھر آؤ گی اس روز میں دنیا کا خوش قسمت ترین انسان ہوں گا۔''

نجمہ کا سانس چڑھا ہوا تھا اور وہ بار بار گھبرا کر اوپر والے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔

''گھبراؤ نہیں نجمہ! یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ آج عید ہے خوشیوں کا دن ہے۔ ہم دونوں کو یہاں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے محبت کرتے دیکھ کر ہر ایک یہی سمجھے گا کہ ڈاکیہ سیڑھیوں میں اطالوی عید کارڈ پھینک گیا ہے۔''

لیکن نجمہ گھبرا رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔''مجھے ڈر لگتا ہے۔''

''کس سے ڈر لگتا ہے نجمہ؟ مجھ سے؟''

نجمہ نے اپنا عطر کے رومال والا ہاتھ یاقوت کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

نجمہ نے ہاتھوں میں مہندی رچا رکھی تھی اور ریشمی رومال حنا کے عطر میں بسا ہوا تھا۔ یاقوت کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے

ہونٹوں پر نرم و نازک پنکھڑیوں والا گلاب کا پھول رکھ دیا ہو۔

''خدا کے لئے ایسا نہ کہو یاقوت! جس سے اتنی محبت ہو اس سے ڈر کیسا؟ میں تو دنیا والوں سے ڈرتی ہوں۔ اپنے رشتہ داروں ہمسایوں، محلے والوں اور قصبے والوں سے ڈرتی ہوں۔ ابھی تو چڑیا نے دو چار تنکے جمع کیے ہیں۔ کہیں یہ لوگ اس میں بھی آگ نہ لگا دیں۔''

یاقوت نے نجمہ کے سیاہ تل پر ہونٹ رکھ دیئے۔ اسے اپنے ہونٹوں پر سچے ریشم کا ملائم دباؤ محسوس ہوا۔ رخسار کے سیاہ تل کا نافہ پھوٹ کر مہک دے رہا تھا۔ یہ ختن کا سیاہ ہرن سنہرے گال کے ریشمی چمکیلے صحرا میں حیران کھڑا تھا۔ یاقوت کو یوں لگا گویا وہ خوشبو کے گہرے غار میں اتر گیا ہے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے بولا۔

''کوئی ہمارے آشیانے کو آگ نہیں لگا سکتا نجمہ۔۔۔۔۔۔۔کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔۔۔ہم ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم ایک ہیں۔ ہم ایک ہیں۔۔۔۔۔۔۔''

نیچے سیڑھیوں میں کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ اکبر کا خسر اوپر آ رہا تھا۔ دونوں جلدی سے الگ ہو گئے۔ یاقوت اوپر چڑھ گیا اور نجمہ جلدی سے نقاب گرا کر نیچے اتر گئی۔ یاقوت نے اوپر جا کر سوچا جب نجمہ اپنے ریشمی ملبوسات سمیٹتی قریب سے گزری ہوگی تو بڈھے کو حنا کی لپٹیں آئی ہوں گی اور اس کے منہ سے بھی اپنی جوانی کو یاد کر کے ٹھنڈی آہ نکل گئی ہوگی۔

نجمہ نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا تو گھر والے اس کی شادی کے بارے میں غور و فکر کرنے لگے نجمہ کو کچھ تشویش ہوئی کیونکہ شادی کے سلسلے میں وہ گھر میں کچھ اس قسم کی افواہیں سن رہی تھی جن سے اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ دراصل نجمہ کی ماں نے اپنی نند کو زبان دے رکھی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کی شادی اس کے بیٹے اصغر سے کر دے گی۔ اصغر لاہور شہر میں وکالت کرتا تھا اور اپنے ماں باپ کے ساتھ وہیں رہتا تھا۔ نجمہ کے باپ کو بھی اپنی بیوی کے پیمان کی خبر تھی اور اسے بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ باقی رہ گئی نجمہ۔۔۔۔۔۔۔تو اس کی مرضی معلوم کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس قسم کے گھرانوں میں لڑکیوں کی (بلکہ لڑکوں کی بھی) شادیاں ماں باپ کی مرضی سے طے پاتی ہیں اور لڑکی اور لڑکے کو جرات نہیں ہوتی کہ وہ ماں باپ کے فیصلے سے انکار کر دے۔

نجمہ نے ساری صورت حالات یاقوت کو لکھ بھیجی۔ یاقوت پریشان ہو گیا۔ نجمہ نے اسے لکھا تھا کہ تم اپنی بھابی کو ہمارے ہاں رشتہ مانگنے بھیجو۔ شاید میرے ماں باپ مان جائیں۔ اب زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ یاقوت نے اسی روز اپنی چھوٹی بھابی کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور اس سے التجا کی کہ وہ نجمہ کا رشتہ مانگنے ان کے ہاں جائے۔ بھابی نے کہا۔

''یہ تو ٹھیک ہے بھائی جان! لیکن میں نے نجمہ کے رشتہ داروں سے اتنا سن رکھا ہے کہ ان کا ارادہ نجمہ کی اس کے پھوپھی زاد بھائی سے کرنے کا ہے۔''

یاقوت نے پاؤں تلے سگریٹ مسل کر کہا۔

''کچھ بھی ہو بھابی تم انہیں منانے کی پوری کوشش کرو۔ میں اپنے حصے کے سارے باغ اور تالاب والی زمین بھی نجمہ کے نام کر دوں گا۔ اصغر سے شادی ہو جانے سے وہ لاہور چلی جائے گی اور مجھ سے بیاہ ہو گیا تو وہ ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے رہے گی۔ میں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھوں گا۔ میں اسے گھر کی رانی بناؤں گا۔ اس کی پوجا کروں گا بھابی۔''

''فکر نہ کریں بھائی جان! میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گی۔ باقی خدا کے ہاتھ میں ہے۔''

نہں نہیں یہ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے تم انہیں راضی کرو۔ انہیں راضی ہونا چاہئے۔ نہیں تو ہم دونوں کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔''

دوسرے روز بھابی یاقوت کے رشتے کی بات کرنے نجمہ کے گھر گئی تو نجمہ کی ماں نے بڑی آؤ بھگت کی۔ جب حرف مدعا زبان پر آیا تو نجمہ کی ماں نے بڑی محبت اور افسوس کے ساتھ انکار کر دیا اور کہا اگر نند کے بیٹے سے بات پکی نہ ہو گئی ہوتی تو یہاں بیاہ کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔ بھابی نے دوسرے دلائل سے بات منوانے کی کوشش کی مگر نجمہ کی ماں اپنے فیصلے پر قائم رہی اور مسلسل انکار کرتی گئی۔ اب بھابی کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ سلام کر کے اٹھے اور واپس چل پڑے۔

نجمہ دوسرے کمرے میں کواڑ سے لگی یہ ساری باتیں سن رہی تھی۔ انکار سن کر اس کا رنگ زرد ہو گیا اور ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے۔ وہ کلیجہ تھام کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس کے آنسو نکل آئے۔ اس نے الماری کھول کر منہ اندر کر لیا اور جی بھر کر روئی۔ یاقوت کے خطوں والے بکس میں سے حنا کی خوشبو نکل رہی تھی۔ نجمہ کی آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور بند پلکوں میں سے مسلسل آنسوؤں کی لڑیاں گر رہی تھیں۔ آج اسے حنا کی خوشبو کسی خانقاہ سے آتی اگربتیوں کی مہک لگ رہی تھی۔

یاقوت کو جب اس بری خبر کا علم ہوا تو وہ بھی بے حد پریشان ہوا۔ اس نے فوراً نجمہ کو خط لکھ کر گھر بلایا۔ نجمہ دوڑی آئی۔ دونوں محبت کرنے والے ناکام محبوب گلے مل کر رو پڑے۔ یاقوت نے نجمہ کے سنہری بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہا۔

''یہ رونے کا وقت نہیں ہے نجمہ! اگر ہم اس وقت روتے رہے تو پھر عمر بھر روتے رہیں گے۔ یہ وقت عقل سے کام لینے کا ہے۔ ظاہر ہے اگر ہم جائز طریقے سے چاہیں تو یہ شادی کبھی نہیں ہو سکتی۔ تمہارے ماں باپ نے صاف انکار کر دیا ہے اور وہ تمہاری شادی

دوسری جگہ طے کر چکے ہیں۔''

نجمہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

''ہائے یہ کیسے ہوگا؟ میں چھت سے لٹک کر خودکشی کرلوں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر اصغر سے شادی نہیں کروں گی۔ ہرگز نہیں کروں گی۔''

''نہیں نجمہ! ہمیں مرنا نہیں ہے۔ ابھی ہماری عمریں ہی کیا ہیں۔ ابھی ہمیں زندہ رہنا ہے۔ بھرپور طریقے سے زندہ رہنا ہے۔ ہمیں زندگی کے مالٹے کا آخری قطرے تک رس نچوڑنا ہے اور صرف اس کا سوکھا سا کھا گوداہی نیچر کو واپس کرنا ہے۔''

نجمہ نے اپنی بھیگی پلکوں والی نسواری آنکھیں اٹھا کر پوچھا۔

''ہم کیا کریں؟ کیسے شادی کریں؟ کیسے زندہ رہیں؟''

''ہمیں یہاں سے بھاگنا ہوگا اور شہر جا کر شادی کرنی ہوگی؟''

نجمہ ایک دم چپ ہوگئی۔ اس کی پلکوں تک آئے ہوئے آنسو وہیں رک گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یاقوت نے اچانک کیا بات کہہ دی ہے۔ جب یاقوت نے پوری تفصیل سے بات واضح کی کہ وہ اسلام پور سے بھاگ کر لاہور جائیں گے۔ وہاں عدالت میں بیاہ کریں گے اور بعد میں گھر والوں کو اپنی شادی سے باخبر کردیں گے اور ان سے آ کر معافی مانگ لیں گے۔''

''وہ ہمیں بہت جلد معاف کردیں گے نجمہ۔۔۔۔۔۔۔۔فوراً معاف کردیں گے۔ ماں باپ یہ کبھی نہیں چاہتے کہ ان کی اولاد ان کی مرضی کے خلاف اپنی پسند کی شادی کرے۔ مگر اولاد شادی کرنے کے بعد واپس آ کر معافی مانگ لے تو ماں باپ فوراً معاف کر دیتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح ان کا شخصی وقار بھی بچ جاتا ہے اور ان کی اولاد بھی گھر واپس آ گئی ہوتی ہے۔''

نجمہ اس وقت جذباتی صدمے کی زد میں تھی۔ وہ بے حد پریشان اور محبت میں بری طرح جتلا تھی۔ چنانچہ اس نے یاقوت کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ طے یہ ہوا کہ اگلے روز سہ پہر کی گاڑی میں سوار ہوکر دونوں اسلام پورے سے لاہور روانہ ہو جائیں گے۔

یاقوت دوسرے روز کچھ ضروری سامان اپنے اٹیچی کیس میں رکھ کر سٹیشن پر ایک گھنٹہ پہلے ہی پہنچ گیا اور پلیٹ فارم پر ایک طرف بنچ پر بیٹھ کر نجمہ کا انتظار کرنے لگا۔ نجمہ نے کہا تھا کہ پورے چار بجے سٹیشن پر پہنچ جائے گی۔ کیونکہ ٹرین سوا چار بجے روانہ ہوتی تھی۔ پونے چار بج گئے۔ چار بجنے میں ایک منٹ رہ گیا۔ نجمہ کہیں دکھائی نہ دیتی تھی۔ قصبے کی جانب سے دو ایک تانگے آئے مگر ان میں دیہاتی عورتوں اور بچوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

یاقوت پریشان ہوگیا۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ چلاتا پلیٹ فارم پر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ چار بج کر پانچ منٹ ہو گئے اور قصبے کو جاتی سڑک ویران تھی۔ اگر اب بھی نجمہ آ جائے تو وہ دس منٹ میں یہ ایک میل لمبی سڑک تانگے میں عبور کر سکتی ہے۔ مگر دور دور تک سوائے کھیتوں میں کام کرتے کسانوں یا سڑک پر بوجھل قدم اٹھا کر آتی جاتی بھینسوں کے اور کوئی نظر نہ آ رہا تھا۔

سوا چار بج گئے۔ گوجرانوالہ سے آنے والی گاڑی کا سگنل گر گیا۔ ان دونوں کو اسی گاڑی میں بیٹھ کر لاہور جانا تھا۔ یاقوت کا ذہن مختلف قسم کے خیالات سے کھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں پاگلوں کی طرح قصبے والی سڑک پر سر پٹختی پھر رہی تھیں۔ نجمہ کہاں ہے؟ نجمہ کیوں نہیں آئی؟ نجمہ کیوں نہیں آئی؟ دور سے گاڑی کی چیخ سنائی دی۔ یاقوت کی چیخ نکل گئی۔ دل قدموں کے ساتھ بوجھل ہوگیا۔ وہ بنچ پر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے قصبے کی سڑک پر ایک تانگہ بھاگتا چلا آتا دکھائی دیا۔ یاقوت بنچ پر سے اچھل پڑا۔ نجمہ آ گئی! نجمہ آ گئی!

وہ اپنا اٹیچی کیس بنچ پر چھوڑ کر تانگے کی طرف بھاگا۔ جب یاقوت تانگے کے قریب پہنچا۔ تو اس کا ننھا قاصد تانگے میں سے اتر کر یاقوت کے پاس آیا اور ایک خط اس کے حوالے کر دیا۔ یاقوت ایک پل کے لئے ساکت ہو کر رہ گیا۔ نجمہ نہیں آئی تھی۔ اس نے خط بھیج کر اپنی معذوری ظاہر کی ہوگی۔ یاقوت نے خط کھول کر پڑھا۔

"۔۔۔۔۔۔۔ میں کیسے آ جاؤں؟ ہائے اللہ میں کیسے گھر سے نکل بھاگوں؟ میری ماں مر جائے گی۔ باپ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ میں کیا کروں؟ رشتہ دار ہنسی اڑائیں گے۔ تم ایک بار پھر بھابی کو بھواؤ۔ اب کے میں بھی ماں سے کہہ دوں گی۔ صاف صاف کہہ دوں گی۔ ہائے اللہ! تمھیں کس قدر مایوسی ہوئی ہوگی! کاش میں پیدا ہی نہ ہوتی۔ میں خودکشی کر لوں گی۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری ہمیشہ تمہاری۔۔۔۔۔۔۔"

یاقوت نے جیب سے قلم نکال کر خط کی پشت پر لکھا:

"۔۔۔۔۔۔۔ تم نہیں آئیں۔ لیکن گاڑی آ گئی ہے۔ میں اس گاڑی میں سوار ہو کر لاہور جا رہا ہوں۔ مرزا سچا تھا۔ جس نے ساندل بار کے تپتے میدان میں اپنا لہولہان بازو آسمان کی طرف اٹھا کر چیخ ماری تھی۔

بھٹ رناں دی دوستی
تے کھری جناں دی مت
پہلاں ہس ہس لاون یاریاں
پچھوں رو کے دیندیاں دس

میں لاہور جا رہا ہوں اور زندگی بھر تمہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔"

یاقوت نے خط ننھے قاصد کے حوالے کیا۔ جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر اس سات آٹھ سالہ بچے کو دیا۔ اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"بیٹا بڑے ہو کر تم بھی محبت کرو گے ضرور کرو گے۔

لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ محبت ہمیشہ شادی کے بعد کرنا اور شادی سے پہلے کبھی نہ کرنا۔"

لاہور جانے والی گاڑی گوجرانوالہ سے آ کر اسلام پور کے پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی تھی۔ ننھا قاصد تانگے میں سوار ہو کر واپس چلا گیا اور یاقوت جلدی سے پلیٹ فارم پر آیا۔ بنچ پر سے اپنا اٹیچی کیس اٹھا کر ریل کے سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گیا۔ اس نے اپنے اور نجمہ کے لئے سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ لے رکھے تھے۔ جب ریل چل پڑی تو یاقوت نے کھڑکی میں سے باہر نکال کر دور آخری بار قصبے کے مکانوں پر ایک نگاہ ڈالی اور نجمہ کا ٹکٹ پرزے کر کے باہر پھینک دیا۔ ٹکٹ کے پرزے ریل کے ساتھ ساتھ اڑ کر کھیتوں میں جا پڑے۔

لاہور آ کر یاقوت نے ایک درمیانے درجے کے صاف ستھرے اور خوش وضع ہوٹل میں ساٹھ روپے ماہوار پر ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور اپنا سامان وہاں لگا دیا۔ اس نے کچھ ضروریات کی مزید اشیا بازار سے خریدیں کچھ کتابیں لیں۔ لاہور میں حکیم اور غلام مصطفیٰ عرف طوفا کلرک سے ملاقاتیں کیں۔ پرانی دوستی کی تجدید کی اور لاہور کی زندگی کا آغاز کر دیا۔ لاہور میں اسے رہتے ہوئے دو برس ہو گئے تھے۔ اس دوران میں وہ ایک بار بھی اپنے گاؤں نہیں گیا تھا۔ اس کے حصے کی رقم اور پھل وغیرہ اس کا بھائی اکبر یا نوکر اسے لاہور آ کر دے جاتے تھے۔ بھابی کا خط اکثر آتا رہتا تھا جس میں وہ کبھی کبھی نجمہ کے بارے میں بھی دو ایک فقرے لکھ دیا کرتی تھی۔ ایک بار اس نے لکھا کہ نجمہ کی لاہور میں منگنی ہو گئی ہے۔ یاقوت نے لکھا کہ اچھا ہوا۔ شروع شروع میں دو چار خط نجمہ کے بھی آئے جن میں اپنے رویے کی معافی مانگی گئی تھی۔ یاقوت نے کوئی جواب نہ دیا۔ نجمہ کچھ دیر تک خط لکھتی رہی۔ پھر اس کا خط ہفتے میں ایک بار پھر مہینے میں ایک بار آنے لگا۔ اس کے بعد خطوط کا سلسلہ بالکل ہی بند ہو گیا۔ یاقوت نجمہ کی اس قدر شدید محبت کو جانے کس طرح ہضم کر کے بیٹھ گیا تھا۔ حکیم سے اس کی امرتسر کے دنوں کی بڑی پرانی دوستی تھی۔ اگرچہ وہ عمر میں یاقوت سے دس سال بڑا تھا لیکن ان کی آپس میں محبت ہم عمروں والی تھی۔ اپنی کیمیاوی حماقتوں اور طبی بوالعجبیوں کے باوجود حکیم بڑا مخلص اور درد دل والا آدمی تھا۔ ایک بار اس نے یاقوت سے کہا تھا۔

''تم اگر نجمہ کی محبت کو ہضم کر سکتے ہو تو مجھے یقین ہے تم سنکھیا بھی ہضم کر سکتے ہو۔''

یاقوت خاموش رہا تھا اور سر جھکا کر سگریٹ پینے لگا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ نجمہ کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔

اچانک باہر بادل زور سے گرجا۔

کیفے پال میں بیٹھے تینوں دوستوں نے بیگ نگاہ باہر دیکھا۔ حکیم نے عینک ٹھیک طرح ناک پر جما کر کہا۔ ''بارش پھر تیز ہو گئی ہو گی۔''

ہوٹل کے شیشے دار دروازے بند تھے اور بارش کی آواز اندر نہیں آ رہی تھی ایک آدمی نے باہر سے آ کر اطلاع دی کہ صرف بادل گرج رہے ہیں بارش نہیں ہو رہی طوفے نے کہا۔

''گھر چلنا چاہئے ماں انتظار کر رہی ہو گی۔''

تینوں دوست ہوٹل سے اٹھ کر باہر آ گئے۔

باہر بڑی سردی تھی۔ ٹھنڈی یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ یاقوت نے کوٹ کے کالر اٹھا لئے۔ حکیم نے کمبل کی بکل کس کر ماری۔ طوفے نے بھی گردن کے گرد مفلر اچھی طرح سے لپیٹ کر قراقلی کی پرانی ٹوپی کو سر پر مزید کھینچ لیا۔ بھیگی ہوئی میکلوڈ روڈ ویران ہو رہی تھی۔ دکانوں کی اکثر روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ نیواڑی اپنی دکان پر چادر میں سکڑا بیٹھا تھا۔ تینوں دوستوں نے پان والے سے ایک ایک پان کھایا اور اپنے محلے کی طرف روانہ ہو گئے۔ حکیم نے پوچھا۔

''تم آج ہوٹل نہیں جاؤ گے کیا؟''

یاقوت نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

''مجھے پری سے ملنا ہے۔''

طوفا بولا۔

''یار میں نے پری کو اپنے دادا کی اک تصویر دی تھی کہ اس میں رنگ بھر دے ذرا اس سے پوچھنا اس کا کیا ہوا؟''

''پوچھوں گا۔''

طوفا سلام کر کے اپنے گھر میں داخل ہونے لگا تو حکیم نے پان کی پیک گلی میں تھوک کر کہا۔

''آج سردی ہے ہرڑ کے ساتھ دودھ میں الائچی ضرور ڈال لینا۔''

''اور جوشاندہ؟''

''وہ تو صبح ضرور پینا۔ میں تمہارے اندر کی پہلے صفائی کرنا چاہتا ہوں علاج بعد میں کروں گا۔''

طوفا اپنے گھر چلا گیا۔ حکیم بھی یاقوت سے ہاتھ ملا کر اپنے مکان میں داخل ہو گیا۔ گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھا بادل ہولے ہولے گرج رہے تھے اور تیز سرد ہوا چل رہی تھی۔ یاقوت گلی کی نکڑ تک گیا اور پھر داہنی جانب ایک چھوٹی سی بغلی گلی میں مڑ گیا۔ ایک مکان کا دروازہ بند تھا۔ اندر بڑا سا بلب روشن تھا جس کی روشنی بند کیواڑوں کی درزوں میں سے باہر چھن رہی تھی۔ یاقوت نے پھٹے پر چڑھ کر آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

اندر ایک دبلا پتلا آدمی جس کی عمر بمشکل تیس برس ہو گی بھورے رنگ کا لنڈے سے خریدا ہوا فوجی سویٹر پہنے کپڑے کے بورڈ پر گیتا بالی کی تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔ یاقوت کو دیکھ کر وہ مسکرایا اور پھر کام میں مصروف ہو گیا۔

''ذرا دروازہ اچھی طرح بند کر دو یار۔ آج تو قلفی جم رہی ہے۔''

یاقوت نے دروازے کو ٹھیک طرح سے بند کر دیا۔ کونے میں انگیٹھی دہک رہی تھی اور اس پر چائے کا پانی رکھا تھا۔ بند فضا میں چائے کی تلخ خوشبو اور ردی تمباکو کا دھواں پھیلا یا ہوا تھا۔ یہ مصور پرسی تھا۔ پرسی عیسائی تھا۔ اور جالندھر کا رہنے والا تھا۔ وہ لاہور کے دو ایک گھٹیا سینما گھروں کو گھسی پٹی پرانی بھارتی فلموں کے بورڈ بنا کر دیا کرتا تھا۔ پرسی بڑا معمولی مصور تھا۔ وہ فلم ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا ناک نقشہ ٹھیک طرح نہیں بنا سکتا تھا۔ اس کی بنائی ہوئی نرگس کی تصویر پر صبیحہ کا اور مسرت نذیر کی تصویر پر شمیم آرا کا دھوکا ہوا کرتا۔ ایک سینما والے کو پرسی نے صبیحہ کی تصویر بنا کر دی۔ یہ تصویر سینما گھر کی پیشانی پر لگا دی گئی۔ انٹرول میں کچھ لوگ منیجر کے پاس ٹکٹ واپس کرنے آ گئے۔ منیجر نے حیرانی سے وجہ پوچھی تو ایک تماشائی نے کہا۔

''جناب آپ نے باہر نرگس کی تصویر لگا رکھی ہے اور اندر صبیحہ دکھلا رہے ہیں۔ ہم نے تو نرگس کا بورڈ دیکھ کر ٹکٹ لئے تھے۔''

اسی روز سے پرسی کے ساتھ سینما والوں نے اپنا ٹھیکہ منقطع کر لیا۔ بورڈوں کے علاوہ پرسی ادھر ادھر کا تھوڑا بہت کام بھی کر لیا کرتا تھا۔ اکیلی جان تھی۔ اسے کام کی اتنی پروا بھی نہیں تھی۔ لیکن جب وقت پر پیسے نہ ملتے تو وہ سینما والوں کو جی بھر کر گالیاں دیتا اور چرس پی کر اس کی آواز زیادہ پرسوز ہو جاتی۔ اسے پنجاب کے کتنے ہی لوک گیت یاد تھے جنہیں وہ گھڑا بجاتے ہوئے گردن اسی طرف لٹکا کر بڑے درد کے ساتھ گایا کرتا۔ پرسی کا باپ مر گیا تھا۔ ماں جالندھر ہی میں کسی کرسچین سکول میں استانی تھی اور ایک بڑی بہن بمبئی

میں کسی بینڈ ماسٹر سے بیاہی ہوئی تھی۔ پرسی ایک عیسائی لڑکی کی محبت میں لاہور آ گیا تھا۔ اور جب سے یہیں پڑا تھا۔ وہ ہر سال پاسپورٹ بنوا کر بھارت اپنی ماں کے پاس جانے کا پروگرام بناتا مگر چرس کی بھول بھلا جاتا۔ کبھی کبھار بمبئی سے اس کی بہن اور جالندھر سے اس کی ماں کا خط آ جاتا تھا۔ خط وہ ہر دوست کو دکھاتا۔ اسے بار بار پڑھتا۔ ہر بار روتا۔ دو ایک روز پاسپورٹ فارم کی تلاش میں ڈاک خانوں کے چکر کاٹتا اور پھر سب کچھ چھوڑ کر نرگس کا بورڈ بنانے میں محو ہو جاتا۔

اس وقت وہ گیتابال کی تصویر میں برش سے رنگ آمیزی کر رہا تھا اور گیتابالی کی صورت پر سنتوش کمار کا دھوکا ہو رہا تھا۔ برش ایک طرف رکھ کر پرسی نے آستین سے ناک صاف کی۔ جھکا جھکا اٹھا اور انگیٹھی یاقوت کے پاس لا کا بوریے پر بیٹھ گیا اور ہاتھ تاپنے لگا۔

"صبح سے کام کر رہا ہوں۔ کوئی ساٹھ پیالی چائے پی گیا ہوں ربڑی ہو گئی ہے۔ تم چائے پیو گے؟"

"حکیم اور میں ابھی ہوٹل سے چائے پی کر آ رہے ہیں۔ ویسے ایک پیالی اور پی لوں گا۔"

پرسی نے جیب سے چرس نکال کر اسے ماچس کی تیلی میں پھنسا کر آگ لگائی۔ پھر پھونک مار کر بجھایا اور گولی کو ہتھیلی پر رکھ کر تمبا کو میں مسلنے لگا۔

"یار! حکیم کی بیوی جوان ہے۔ پھر یہ رات کو گیارہ بجے تک باہر کیوں رہتا ہے۔ اس کو خبر نہیں کہ جوان عورت کی تو ربڑی ہو جاتی ہے؟"

ربڑی پرسی کا تکیہ کلام ہے۔ اس کا ہر چوتھا جملہ اس تکیے پر سر رکھے آرام کرتا ہے۔ یاقوت نے تھری کیسل کا سگریٹ سلگا کر کہا۔

"ہمیں ایسی باتوں میں دلچسپی نہیں لینی چاہئے اور پھر حکیم ہمارا دوست ہے۔ دوست کی بیوی کے بارے میں ہم ایسی باتیں کیوں سوچیں؟"

پرسی نے سگریٹ کے خول میں چرس ملا تمبا کو بھرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے یار! دوست اگر غلطی کرے تو اسے ٹوکیں بھی نہ؟ اول تو اس عمر میں حکیم کو اٹھارہ سال کی لڑکی سے بیاہ کرنا ہی نہیں چاہئے تھا اور اب اگر کر لیا ہے تو آدھی آدھی رات تک اس سے الگ نہیں رہنا چاہئے۔"

یاقوت نے کوئی جواب نہ دیا اور آگ تاپتا رہا۔ کیتلی میں چائے ابلنے لگی تھی۔ پرسی نے سگریٹ بوریے پر رکھ دیا اور کیتلی اتار کر پیالوں میں چائے انڈیل دی۔ گرم گرم بھاپ کے ساتھ چائے کی خوشبو اوپر کو اٹھی۔ یاقوت کے ذہن میں ایک بار ایسی وادی کا خیال آ گیا جہاں برفباری ہو رہی تھی اور برف پوش درختوں کے نیچے ایک بند کاٹج میں آتشدان کے پاس بیٹھی خوبصورت سنہری بالوں والی

لڑکی اپنے عاشق کو خط لکھ رہی تھی۔ اسے وہ خط یاد آ گیا جو وہ نجمہ کو لکھا کرتا تھا۔ جن کے ہر صفحے پر وہ نرگس کے زرد پھول بنایا کرتا تھا۔ جن کی ہر سطر پر وہ حنا کا خوشبودار عطر ملا کرتا تھا۔ پھر اسے نجمہ یاد آ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے برف پوش وادی کے ٹھٹھرے سناٹے میں نجمہ ایک کاٹج کی کھڑکی کا پٹ کھولے اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ پھر نجمہ نے دلی کی بنگالی لڑکی سومیتا کا روپ دھار لیا جو اپنے مکان کے اندر درگا کی مورتی کے سامنے بیٹھی آنکھیں بند کئے بھجن گا رہی تھی۔ اسے کبیر کا خیال آ گیا۔

نین ہمرے تمری اور

کیوں لیو مکھ موڑ۔۔۔۔۔۔۔۔سجنوا؟

پھر اس کے دل نے ایک شور کہہ دیا۔ ایک شعر۔ ایک موتی۔ جسے دریا کی سیلابی موجوں نے آپ سے آپ اچھال کر کنارے پر پھینک دیا تھا۔ اس نے یہ شعر جو نثر کی چند سطریں تھیں یاد کر لیا۔

"برف! برف! برف!

برف گر رہی ہے

سردیوں کے پہاڑی پھول کی

سفید پتیاں!

پہاڑوں کے منجمد آنسو!

میرے پاؤں ٹھٹھر کر پتھر ہو گئے ہیں

میں ان پتھروں کو لے کر اپنے گاؤں کیسے جاؤں؟

یاقوت چائے پینے لگا۔ پری چائے پیتے ہوئے بولا۔

"آج ساری رات کام کرنا ہے۔ صبح اگر سینما والے نے پیسے نہ دیئے تو میں اس بورڈ کو اس کے سامنے آگ لگا دوں گا۔ کل اتوار ہے اور مجھے ایلس کو گرجے لے جانا ہے اور ہوٹل میں کھانا کھلانا ہے۔"

یاقوت نے کہا۔

"بورڈ تو مکمل ہو گیا ہے۔"

پرسی اپنی چندھیائی ہوئی آنکھوں سے بورڈ کو تکنے لگا پھر ایک گالی دے کر بولا۔

''ابھی اس کی ریڑی کرنی باقی ہے۔''

چائے کی پیالی خالی کر کے اس نے چرس بھرا سگریٹ سلگا لیا اور اوپر تلے چھ سات کش لگائے۔فضا چرس کثیف دھوئیں سے بھر گئی۔یاقوت کو چکر سا آ گیا۔

''تھوڑا سا دروازہ کھول دو یار۔''

یاقوت نے تھوڑا سا دروازہ کھول دیا۔دھواں باہر نکلنے لگا۔

چرس کا پورا سگریٹ پی کر پرسی اٹھا۔دروازہ بند کر کے کونے سے گھڑا اٹھا لایا اور انگیٹھی کے پاس اسے گود میں لے کر بیٹھ گیا۔اس کی نشہ بھری سرخ آنکھیں بند تھیں۔ہاتھ گھڑے پر چل رہے تھے گردن ایک طرف جھکی تھی اور خشک و پرسوز آواز کے ساتھ یہ گیت بلند ہوا۔

تھڑیاں باجھ نہ سوہندے پپل
پھلاں باجھ پھلاہیاں
ہساں نال حمیلاں سوہندیاں
بنداں نال گجرائیاں
دھن بھاگ میرے آکھے پپل
کڑیاں نے پینگھاں پائیاں
ساون وچ کڑیاں نے
پینگھاں اسمان چڑھائیاں

نہ چبوتروں کے بغیر پیپل اچھے لگتے ہیں۔نہ پھولوں کے بغیر پھلاہ کا درخت۔۔۔۔۔۔۔۔۔نہ ہس کے ساتھ حمیل بھلی لگتی ہے اور نہ بند کے ساتھ گجرائی۔پیپل کہتا ہے میں خوش قسمت ہوں کہ نوجوان لڑکیوں نے مجھ پر جھولے ڈالے ہیں۔ساون میں لڑکیوں نے

اپنے جھولے آسمان کی طرف بڑھانے شروع کردیئے ہیں۔)

گیت ختم ہوگیا۔ پیپل کی آواز بند ہوگئی۔ کنواریاں اپنے جھولوں سے اتر کر چلی گئیں۔ لیکن پرسی کے ہاتھ گھڑے پر چلتے گئے۔ پھر ہاتھ رک گئے۔ اس نے گردن اٹھائی پلکیں کھول کر اپنی سرخ سرخ نشہ آلود آنکھوں سے یاقوت کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پرسی کے سوکھے بے بس چہرے پر ایک زہر بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''پیپل کہتا ہے میں خوش نصیب ہوں۔ مجھ پر کنواریوں نے جھولے ڈالے ہیں۔ پرسی کہتا ہے۔ میں بدنصیب ہوں جو اپنی ماں کو جالندھر چھوڑ کر یہاں آگیا ہوں۔ یہاں میرا کون ہے؟ یہاں ہمارا کون ہے بھلا؟ ایلیس؟ اونہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو میری ربڑی کررہی ہے۔ جس روز میرے پاس پیسے نہیں ہوتے وہ کنٹر کے ساتھ سینما دیکھنے چلی جاتی ہے وہ تو پیسے کی یار ہے۔ میری یار نہیں ہے۔ میری تو بڑی بہن ہے۔ پیاری بہن ہے جو بمبئی میں ہے۔ اس حرامزادے کھوسٹ بینڈ ماسٹر کے پاس ہے جو اسے مارتا ہے۔ میری تو ماں ہے۔ پیری ماں ہے جو جالندھر بیٹھی میری صورت کو ترس رہی ہے اور میں یہاں بیٹھا چرس پی پی کر پاگل ہو رہا ہوں اور اس بہن کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گیتابالی کی تصویر بنا رہا ہوں۔''

پرسی نے جوتا اٹھا کر گیتابالی کی تصویر پر دے مارا۔ یاقوت نے جلدی سے پرسی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''کیا کر رہے ہو تم۔ پاگل تو نہیں ہوگئے؟''

پرسی کا ذہن چرس کے خشک نشے مے ماؤف سا کر دیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ سینے پر مار کر کہا۔

''ہاں میں پاگل ہوں۔ اگر پاگل نہ ہوتا تو جالندھر سے یہاں نہ آتا۔ اپنی پیاری ماں کو ممی کو نہ چھوڑتا۔ اس کتی ایلس کا اعتبار نہ کرتا۔ میں پاگل ہی تو ہوں اور تم بھی پاگل ہو۔ بالکل پاگل۔۔۔۔۔۔۔۔'' پرسی گھڑا بجانے لگا۔ پھر اچانک رکا اور آستین سے ناک پونچھ کر بولا۔ ''یار معاف کرنا۔ نشہ بہت ہی کتی شے ہے۔''

پھر اپنی پیالی میں چائے انڈیل کر بولا۔ ''تم اور چائے پیو گے؟''

یاقوت نے چوتھا سگریٹ سلگا کر کہا۔

''نہیں۔ بہت پی چکا ہوں۔''

پرسی مسکرایا۔

''لالہ! کبھی چرس کا ڈمکا بھی لگا کر دیکھو۔ تمہارے سارے غم ربڑی کردے گی۔''

یاقوت نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پری! یہ چیز صرف تمہیں راس ہے۔ تم اسے پیو۔''

میں تمہیں اس کے پینے سے منع نہیں کرتا۔ لیکن کسی دوسرے کو کبھی اس کی دعوت نہ دینا۔''

پری نے دوسرا سگریٹ بھر لیا اور اس کے کش لگا کر مسکرایا اور دھواں اڑا کر بولا۔

''ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔۔ کیسا وقت تھا وہ بھی۔

جالندھر میں ہم ایک کٹڑی میں رہا کرتے تھے۔ کٹڑی کے درمیان شہتوت پر چڑھ کر کالے کالے سے میٹھے میٹھے شہتوت کھایا کرتے تھے۔ کرسمس کے دنوں میں میری ماں کیک بناتی تھی۔ ہم اپنے حصے کا کیک ہاتھ میں لے کر باہر نکل جاتے اور اپنے ہمجولیوں میں بانٹ کر کھایا کرتے تھے۔ ہائے ہائے اب کیا ہو گیا وقت کو؟ ربڑی ہو گئی ہے۔ ربڑی ہو گئی ہے۔۔۔۔۔۔۔''

پھر بولا۔'' ہماری کٹڑی میں سردیوں میں صبح صبح ایک فقیر اکتارے پر گاتا آیا کرتا تھا۔ ہم بستروں میں دبکے ہوتے تھے۔ اس کی درد بھری آواز مجھے آج بھی یاد ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کل کی بات ہو۔ وہ گایا کرتا تھا۔''

پری نے سگریٹ کا گہرا کش لگا کر اسے رنگ کے ڈبے پر رکھا۔ منہ سے ایک لمبی ہائے نکالی اور گھڑا بجاتے ہوئے گانے لگا۔ اب اس کی آواز بے حد خشک اور پھیکی ہو رہی تھی۔

تیرا ہو جاؤ باغ ویران
تے مالی نے ٹر جاناں

(تیرے باغ کا مالی چلا جائے گا اور تیرا باغ ویران ہو جائے گا۔)

پنجابی کے اس ایک شعر کو وہ بار بار دہراتا چلا جا رہا تھا۔ گاتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ اس کا گلا خشک ہو گیا۔ آواز ڈوب گئی۔ گھڑے پر ہاتھ رکھ گئے۔

''یاقوت! تم میرے یار ہو۔ دس برس سے یار ہو۔ مجھے بتاؤ کیا وہ فقیر سچا نہیں تھا؟ وہ تو کہتا پھرتا تھا۔ گلی محلے جا جا کر کہتا پھرتا تھا کہ مالی چلا جائے گا۔ باغ ویران ہو جائے گا۔ اور پیپل کہتا تھا کہ میری ٹہنیوں پر کنواریوں نے پینگیں بڑھالی ہیں۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں ہائے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن جب اس کی ربڑی ہوئی تب پتہ چلا۔ جب راجے کی اونٹنیاں آ کر اس کے پتے کھا گئیں تب پیپل کو ہوش آیا۔ ہائے ہائے ہائے۔

مرن راجے دیاں ڈاچیاں

نالے آپوں مرے اوہ راجہ

باہر بادل زور سے پھر گرجا اور ساتھ ہی ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔ پرسی کو ہوش کی ایک لہر سی آئی۔ یاقوت نے ہوٹل جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو پرسی گھڑا ایک طرف رکھ کر اٹھا۔ برش کو رنگ میں ڈبویا اور گیتا بالی کے بالوں میں پھیر کر بولا۔

''مجھے بھی یہ بورڈ ختم کرنا ہے یار۔ لیکن باہر تو بارش ہونے لگی ہے۔ ابھی بیٹھو لالہ! ابھی تو بارہ ہی بجے ہیں۔''

''تم کام کرو۔ میں جاتا ہوں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''مالک ہو بھائی۔''

اتنا کہہ کر پرسی بڑے انہماک سے کام کرنے لگا۔ پھر اچانک بولا۔

''یار خیال رکھنا۔ صبح میں پاسپورٹ کے فام لاؤں گا۔ انہیں ذرا بھر دینا۔ اب میں جالندھر اپنی ماں سے ملنے ضرور جاؤں گا۔''

یاقوت مسکرایا اور پرسی کی دکان سے نکل کر باہر گلی میں آ گیا۔ ترپ ترپ مینہ پڑ رہا تھا۔ سردی جوبن پر تھی۔ مکانوں کے کھڑکیاں' دروازے بند تھے۔ کسی جگہ بھی روشنی نہیں تھی۔ گلی کے نکڑ والے کھمبے پر کمزور بلب بھیگی بھیگی روشنی بکھیر رہا تھا۔ یاقوت جب حکیم کے مکان کے نیچے سے گزرا تو کسی نے اوپر سے سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا گلی میں پھینکا۔ اس نے سوچا شاید حکیم اس وقت طب کی کسی پرانی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر مکان کی طرف دیکھا۔ وہاں کسی روشندان پر روشنی نہیں ہو رہی تھی۔ پھر یہ اندھیرے میں سگریٹ کون پی رہا ہے' یاقوت گلی سے گزر گیا اور بازار میں آ گیا جہاں سے وہ اپنے ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا طوفے کلرک نے اوپر سے پھینکا تھا۔ وہ اس وقت حکیم کے مکان کی چھت پر برساتی میں حکیم کی اٹھارہ سالہ بیوی داری کے ساتھ لگ کر بیٹھا تھا۔ دونوں نے ایک ہی کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ اور سردی میں ٹھٹھرے ایک دوسرے میں گھسے بیٹھے تھے۔ داری اپنے ادھیڑ عمر خاوند اور اس کے چھ بچوں کو سلا کر چپکے سے پانی کا لوٹا لے کر اوپر آ گئی تھی جہاں اس کا جوان عاشق طوفا کلرک برساتی میں دیوار کے آگے کھڑی چارپائی کے پیچھے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب طوفے نے سگریٹ کا ٹکڑا نیچے پھینکا تو داری نے گھبرا کر کہا تھا۔

''ہائے سگریٹ نہ پھینکو۔ گلی میں سے کوئی گزر رہا ہے۔''

''میں دیکھتا ہوں کون جا رہا ہے۔''

طوفے نے منڈیر سے جھانک کر گلی میں دیکھا تو اسے گلی کے نکڑ والے بلب کی ہلکی ہلکی روشنی میں یاقوت نظر آیا جو دونوں ہاتھ لمبے کوٹ کی جیبوں میں ٹھسائے چپ چاپ گزر رہا تھا۔ طوفا مسکرایا۔ داری نے سرگوشی میں پوچھا۔

''کون تھا؟''

''کوئی نہیں۔''

طوفے نے جلدی سے داری کے اوپر کمبل ڈال دیا اور اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''تمہارا سویٹر بڑا گرم ہے داری۔ میرے ہاتھوں میں سے سینک اٹھنے لگا ہے۔''

داری بڑی خوش ہوئی۔

''یہ میں نے خود بنا تھا۔''

''طوفے نے داری کا گال چوم کر کہا۔

''ظالمے! ہمیں سویٹر نہ بن کر دیا تو نے؟''

''تمہارے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ تم میرا سویٹر لے لو۔''

اور پھر خود ہی ہنس پڑی۔ اندھیرے میں داری کے سفید دانت چمکنے لگے۔ داری نوجوان ان پڑھ اور الہڑ لڑکی تھی جس کے گندمی بھرپور جسم میں سے جوانی کی تند اور گرم شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اسے بغل گیر ہوتے ہوئے طوفے کلرک کو اپنے جسم کی تمام بیماریاں دور ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے اب محسوس ہوا تھا کہ اس کے روگ کا علاج حکیم کی پڑیوں' جوشاندوں اور ہلیلہ بلیلہ کی بجائے اس کی گدرائے ہوئے جسم والی نوجوان بیوی کے پاس ہے۔ طوفے نے سرگوشی میں پوچھا۔

''اگر تمہارے خاوند کو پتہ چل گیا تو تم کیا کہو گی؟ وہ تو تمہیں بہت مارے گا۔''

داری نے گردن جھٹکا کر کہا۔

''اونہہ مارے گا۔ میں اسے کیا سمجھتی ہوں۔ میری تو قسمت ٹھوٹ گئی جو ماں باپ نے اس بڈھے کے پلے باندھ دیا۔ میں اسے صاف صاف کہہ دوں گی کہ میں طوفے سے پیار کرتی ہوں۔ عورت پیار میں کسی کی پرواہ نہیں کرتی۔ کیا سوہنی گھڑے پر دریا پار نہیں کیا کرتی تھی؟ سسی اپنے پنوں کی تلاش میں تھلوں میں نہیں نکل گئی تھی؟ تم بھی میرے پنوں ہو۔ میں تمہارے لئے کچھ کر گزروں گی۔ میں بڈھے حکیم کی کیا پروا کرتی ہوں۔ میں اگر چاہوں تو ایک پل میں اس کے گندے مندے بچے اس کے حوالے کر کے جا سکتی

ہوں۔"

طوفا کلرک کانپ گیا۔ داری اس کے لئے محض وقت کاٹنے کا ایک وسیلہ تھی۔ وہ وقتی طور پر اس کے جسم سے لذت حاصل کر رہا تھا۔ وہ داری سے شادی بھی نہیں کرسکتا تھا۔ داری اس کے قریب دوست کی بیوی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی روز حکیم پر یہ راز افشا ہو گیا تو وہ اسے منہ نہ دکھا سکے گا۔ طوفا بزدل اور کمزور تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ناجائز طریقے سے ایک ضرورت مند لڑکی پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ ایسی لڑکی جس پر اس وقت جوانی کا بھوت سوار تھا۔ طوفا کالا سہی' دبلا سہی' مگر جوان تھا اور داری کو ایک جوان مرد کی ضرورت تھی۔ داری اس کے عشق میں آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ وہ سوہنی بن چکی تھی اور اپنے خیال میں گھڑے پر لیٹ کر چناب پار کر کے اپنے مہینوال سے ملنے آیا کرتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہیر سیال تصور کرتی تھی جو چوری کا کٹورا لئے اپنے رانجھے سے ملنے جاتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ یہ وہ ہیر تھی جسے اس کے نابائی باپ نے بڈھے سیدے سے بیاہ دیا تھا۔ داری کو تو ہر حال میں اپنے لئے ایک نہ ایک رانجھا تلاش کرنا تھا۔ وہ تو چوری کا کٹورا ہاتھوں میں لئے دو سال سے اپنے بڈھے خاوند سیدے کے گھر کی کھڑکی میں رانجھے کا انتظار کر رہی تھی کہ طوفے کلرک نے بانسری پر محبت' ضرورت' خواہش اور ہوس کا راگ چھیڑ دیا اور داری آدھی رات کو چوری کا کٹورا لے کر برساتی میں طوفے کے کمبل میں آن گھسی۔

داری نے طوفے کی گرم قمیص کے اندر ہاتھ گھسیڑ کر اس کی چھاتی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"جانی! تم مجھ سے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟ پھر ہمیں اس پالے میں ٹھٹھر ٹھٹھر کر ملنے کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ اپنا آرام سے لحاف میں لیٹ کر گرم ہو کر پیار کریں گے۔"

طوفے کی گردن پر چونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ داری سے شادی کرنے کا وہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا۔ وہ اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کم از کم اپنی شادی تک وہ داری کو قابو میں رکھنا چاہتا تھا۔ داری عورت تھی وہ حکیم کے گھر میں نا آسودہ تھی۔ اسے ایک گھر چاہئے تھا۔ جہاں وہ خوش رہے۔ اپنے خاوند کے ساتھ' اپنے بچوں کے ساتھ........ وہ روز روز کی ملاقاتوں کی بک بک سے تنگ آ گئی تھی۔ طوفا اپنی ضرورت سے مجبور تھا اور داری اپنی فطرت سے مجبور تھی۔ دونوں مجبور سیارے تھے جو اپنی اپنی ضرورت کے محور کے گرد گھوم رہے تھے۔ اس نے داری کے بھرے بھرے ہونٹوں پر انگلی پھیر کر کہا۔

"میں تم سے شادی کروں گا داری۔"

"مگر کب میری جان؟ کب؟" داری نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

''پہلے میں اپنی دونوں بہنوں کو بیاہ لوں۔ اگر میں نے پہلے شادی کر لی تو لوگ کہیں گے کیا بے غیرت بھائی ہے۔ جوان بہنیں گھر میں بیٹھی ہیں اور اپنا بیاہ رچا رہا ہے۔''

داری نے اداس ہو کر گردن جھکا لی۔

''خدا جانے تمہاری بہنوں کی شادی کب ہو؟'' پھر خوش ہو کر بولی۔ ''میں ان کے لئے کوئی رشتہ تلاش کروں؟''

طوفا ہنس پڑا۔

''کتنی بھولی ہو تم داری! تم کہاں رشتہ تلاش کرتی پھرو گی۔ یہ کام تو میرے ماں باپ ہی کریں گے اور پھر جب تم حکیم سے الگ نہیں ہوتیں میں تم سے کیسے بیاہ کر سکتا ہوں؟''

طوفے کا خیال تھا کہ داری طلاق کا نام سن کر گھبرا جائے گی اور اپنا ارادہ ملتوی کر دے گی۔ مگر داری نے سر اٹھا کر کہا۔

''اگر تم کل مجھ سے بیاہ کرنے پر راضی ہو جاؤ تو حکیم سے میں آج ہی طلاق لے لیتی ہوں۔ اس کا کیا ہے۔ اسی لئے تو میں بچہ پیدا نہیں کر رہی۔''

طوفا کلرک کانپ گیا۔

''نہیں نہیں داری ابھی ایسا نہ کرنا۔ ابھی ایسی کوئی بات نہ کرنا۔ جب تک میں تمہیں نہ کہوں تم اپنی طرف سے کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا۔''

پھر لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔

''لیکن تم کیسے بچہ پیدا ہونے نہیں دیتیں؟ مجھے بھی تو بتاؤ۔''

داری شرما گئی۔ طوفے کے اصرار پر بولی۔

''اول تو میرا خاوند بچہ پیدا کر ہی نہیں سکتا اور پھر میں بھی روک دیتی ہوں۔''

''کیسے روک دیتی ہو؟''

داری نے طوفے کلرک کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

''تم چپ رہو۔ ایسی باتیں نہیں پوچھا کرتے۔ تمہیں ان باتوں سے کیا سروکار؟''

کلرک نے حکیم کی بیوی کو گلے سے لگا لیا اور دیر تک اسے چومتا چاٹتا رہا۔ اس کتنے کی طرح جسے یقین ہو کہ اس ایک ہڈی کے سوا

اسے شہر میں اور کچھ نہ مل سکے گا۔ داری کے منہ سے کیکر کی چھال کی بو آ رہی تھی۔ طوفے نے پوچھا۔

''تم کیکر کھاتی ہو داری؟''

داری ہنس پڑی

''نہیں تو۔''

''پھر تمہارے منہ سے کیکر کی بو کیوں آ رہی ہے؟''

''ارے یہ تو میں نے آج داتن کیا ہے۔ دنداسہ ملا ہے۔ بڑا کڑوا تھا۔''

طوفے نے حکیم کی بیوی کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے پکڑ لیا۔ طوفے نے انگریزی فلموں میں ایکٹروں کو بوسہ بازی کرتے دیکھا تھا وہ اپنی دانست میں بڑے سٹائل کے ساتھ مارلین برانڈو کی طرح صوفیہ لورین کو پیار کر رہا تھا۔ لیکن ایک تو سردی' دوسرے موٹا کمبل اسے کچھ نہیں کرنے دے رہا تھا۔ داری کے پیار میں کوئی سٹائل کوئی بناوٹ' کوئی اختراع اور کوئی انداز نہ تھا۔ وہ سیدھے سبھاؤ سمٹی سمٹائی گیند بنی بیٹھی تھی۔ اور ہاتھ طوفے کے کندھوں پر اور ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھے پیار کئے جا رہی تھی۔ دونوں کے پیار میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن حکیم کی چھت پر اس ابر آلود جنوری کی بارانی رات کو زمین و آسمان ملے ہوئے تھے۔ بادل دھیمے دھیمے گرج رہا تھا۔ برساتی پر بوندوں ک ٹاپ ٹاپ جاری تھی۔ دونوں کو سوائے ایک دوسرے کے جسموں کی گرم پراسرار سرگوشیوں کے اور کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ اچانک نچلی منزل میں کسی بچے کے رونے کی آواز بلند ہوئی۔ داری نے جلدی سے ہونٹ الگ کر لئے۔

''لالی جاگ پڑی ہے۔ میں جاتی ہوں پرسوں ملوں گی۔''

اور طوفے کے جواب کا انتظار کئے بغیر داری جلدی سے کمبل میں سے نکلی بال درست کئے۔ اپنی کھرے میں انڈیلا اور لوٹا لے کر جلدی سے نیچے اتر گئی۔

طوفے کلرک نے کمبل اچھی طرح لپیٹا۔ برساتی میں سے باہر نکلا۔ دبے پاؤں چوروں کی مانند چھت پر چلتا منڈیر تک آیا اور پھلانگ کر دوسری جانب اپنے کوٹھے پر جا کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اگلے روز بھی موسم ابر آلود تھا۔

رات بھر کی بوندا باندی سے گلے محلے کیچڑ سے بھر گئے تھے۔ سردی زیادہ ہو گئی تھی۔ اتوار ہونے کی وجہ سے شہر کہ گہما گہمی میں

مزید کمی ہوگئی تھی۔ میکلوڈ روڈ پر معمول سے کم رونق تھی۔ مال روڈ بھی نسبتاً خالی خالی تھی۔ سردی اور چھٹی کے باعث لوگ زیادہ تر گھروں میں ہی دبکے بیٹھے تھے۔ طوفا کلرک نو بجے سو کر اٹھا۔ منہ ہاتھ دھویا رومال لے کر خواجہ قاندرو یعنی نانبائی کے تنور پر آ گیا۔ سب گھر والوں کے لئے معمول کے مطابق کلچے لئے اور گھر چلا آیا۔ سبز چائے کے ساتھ اس نے کلچہ کھا کر ناشتہ کیا اور حکیم کی دکان پر آ کر بیٹھ گیا۔ حکیم نے دکان لگالی تھی۔ وہ گدی پر بیٹھا بڑے مرتبان میں سے گاجر کا مربہ نکال کر شیشے کے بیام میں ڈال رہا تھا۔ طوفا اس کے پاس ہی دری پر کمبل کی بکل مار کر بیٹھ گیا۔ سامنے پڑی ہوئی مٹی کی چھوٹی سی انگیٹھی میں جو لیے دہک رہے تھے۔ حکیم نے بیام پر ڈھکن چڑھا کر ہاتھ صاف کئے اور طوفے سے پوچھا۔

''رات ہرڑ کھالی تھی ناں؟''

طوفا ہرڑ کھا کر ہی اس کی بیوی سے ملنے چھت پر گیا تھا۔

''ہاں کھالی تھی۔''

''اور صبح جوشاندہ تو نہیں پیا ہوگا۔''

''وہ بھی پی لیا تھا۔ بس پی کر ہی آ رہا ہوں۔''

حالانکہ طوفے نے دو تین روز سے جوشاندہ بند کر رکھا تھا۔ حکیم کی موٹی موٹی پڑیاں کھا کھا کر وہ تنگ آ گیا تھا۔ اس کا پیٹ سالوں سے خراب چلا آ رہا تھا۔ روٹی کھانے کے بعد اس کے پیٹ میں ضرور درد اٹھتا تھا۔ حکیم کے کہنے کے مطابق وہ روٹی کے دوران آدھی ٹکیا نوشادر بھی کھاتا رہا تھا۔ مگر کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ اب اس نے روٹی ہی کم کر دی تھی۔ اس سے درد میں آفاقہ ہو گیا تھا مگر جسم کمزور ہونے لگا تھا۔ شام کو اس کے سر میں درد ضرور رہتا تھا۔ اس کا علاج بھی حکیم بدذائقہ معجونوں اور جڑی بوٹیوں سے کر رہا تھا۔

داری نے اوپر سے آواز دی۔

''چائے منگوالیں' میں نے کہا۔''

''اچھا'' حکیم نے جلدی سے جواب دیا اور پھر طوفے سے بولا۔

''طوفے! سیڑھیوں میں اپنی بھابی سے چائے پکڑ لینا۔''

طوفا جلدی سے اٹھا اور سیڑھیوں میں آ گیا۔ داری اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ طوفے نے کیتلی ہاتھ میں لیتے ہوئے داری کا گال چوم لیا۔ داری شرما کر جلدی سے اوپر بھاگ گئی۔ طوفا کیتلی ایک طرف رکھ کر کمبل سے منہ پونچھتا دری پر آگ کے سامنے بیٹھ

گیا۔حکیم نے الماری میں سے دو پیالیاں نکال کر دری پر رکھ دیں۔

''چائے ڈالو۔سردی نے تو کمال کر دیا ہے۔''

دونوں چائے پینے لگے۔دکان پر ایک بھی گاہک نہیں آ رہا تھا صبح دو تین گاہک گاجر کا مربہ لینے آئے تھے۔حکیم نے بگلے کا سگریٹ سلگا کر کہا۔

''مائی گوجری کو تھاپیوں کا کہہ دیا تھا نا؟

''ہاں وہ تو کل صبح ہی کہہ دیا تھا۔سوا من تھاپیاں چاہئیں یا زیادہ؟''

''پورا سوا من بھائی۔ایک تھاپی کم یا زیادہ نہیں ہونی چاہئے نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔یہ ایک طرح کی کیمیا وی گری ہی ہے۔کوئی مذاق نہیں ہے۔''

''کوئی فکر کی بات نہیں سہ پہر کو سوا من تھاپیاں یہاں آ جائیں گی۔''

''اور تانبے کے پیسے کا کیا بنا؟علم الدین سنار سے لے آئے تھے کیا؟''

''کہتا تھا گھر پر رکھا ہے۔آج کا وعدہ کیا ہے اس نے''

''بھائی دوپہر کو جا کر اس سے ضرور لے آنا۔اس کے بغیر گاڑی نہ چل سکے گی۔''

دونوں کچھ دیر خاموشی سے چائے پیتے رہے۔اب طوفے نے بھی بگلے کا سگریٹ سلگا لیا تھا۔حکیم کے جھری دار سوکھے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ طوفے کی طرف جھک کر بولا۔

''طوفے میاں!تانبے کا ایسا کشتہ بنا کر دکھاؤں گا کہ حکیم اجمل خان زندہ ہوتے تو شاگردی کر لیتے۔یہ نسخے تو خاندان کے راز ہیں جو سینہ بسینہ چلے آ رہے ہیں۔امریکہ کے سائنس دانوں نے راکٹ بے شک بنا لئے ہیں لیکن وہ تانبے کو مار کر کشتہ ابھی تک نہیں بنا سکے۔خدا کی قسم لوگ اگر ولائت میں ہوتے تو ہماری قیمت لاکھوں روپے پڑتی۔''

طوفے نے چائے پر آئی بالائی انگلی سے منہ میں ڈال کر کہا۔

''مگر حکیم جی دتا کمہار کشتہ کھانے پر راضی ہو گیا ہے ناں؟''

''اس کا تو باپ بھی راضی ہوگا۔طوفے میاں اسے تو میں پھر سے جوان کر رہا ہوں۔سونا کھلا رہا ہوں اس مٹی کے مادھو کو۔خدا کی قسم ایک تنکا کشتے کی خوراک کھا کر اگر سر کے بال کالے نہ ہوں جھریاں غائب نہ ہوں اور وہ گھوڑے کی طرح نہ دوڑتا پھرے تو میرا

نام بدل دینا۔ مصیبت یہ ہے کہ چیز بڈھوں کے لئے بنائی جاتی ہے میرے تمہارے طرح کے جوان کھالیں تو دیکھتے بدن تانبے کی طرح سیاہ پڑ جائے اور کھال پھٹ جائے۔''

''حکیم جی! اس کے لئے خوراک کی بھی ضرورت ہوگی۔''

حکیم نے پیالی دری پر رکھ دی اور گلوبند سے منہ پونچھ کر کہا۔

''وہ تو ہر حالت میں اسے کھلانی پڑے گی۔ نہیں تو اگلے جہان کو چلا جائے گا۔''

طوفے نے بگلے کا سگریٹ حکیم کی طرف بڑھایا۔

''اندازاً روز کی کتنی خوراک اسے کھلانی پڑے گی؟''

حکیم نے سگریٹ لے کر جلایا۔ ایک کش لگایا اور کھانس کر بولا۔

''کچھ نہیں تو دو سیر گوشت آدھ سیر گھی میں بھون کر ہر روز اسے کھلانا ہوگا۔ کم از کم چار سیر دودھ بھی اسے دینا ہوگا۔''

طوفے نے حیرانی سے پوچھا۔

''لیکن وہ بڈھا کمہار اتنی خوراک ہضم کرے گا؟''

حکیم مسکرایا اور طوطے کی طرح گردن گھما کر چٹکی مار کر سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر بولا۔

''طوفے میاں! کشتہ دکھا کر دتے کمہار کو اتنی بھوک لگے گی کہ اپنا گدھا بھی بھون کر سالم کھالے تو اسے کچھ نہ ہوگا۔ کشتے کا یہی تو فائدہ ہے کہ اس سے بھوک دس آدمیوں کی ہو جاتی ہے آدمی پتھر بھی کھالے تو ہضم ہو کر بدن کا جزو بن جاتا ہے۔ جوان کو اس لئے نہیں دیتے کہ جوان کے اندر پہلے ہی بڑی گرمی ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بھڑکتی ہوئی آگ میں پٹرول ڈال دوگے تو وہ اتنی بھڑک اٹھے گی کہ بجھائی نہ جائے گی اور اگر ٹھنڈی انگیٹھی میں تیل ڈال کر کوئلے جلاؤ گے تو وہ صرف حرارت پہنچائے گی اور کچھ نہیں کہے گی۔ ارے بڈھے کمہار کی تو قسمت جاگ اٹھے گی۔ بے شک چار شادیاں ایک دم کرلے۔ خدا کی قسم اٹھارہ سال کا لڑکا نہ بنادوں تو کسی حکیم نہیں نانبائی کا نطفہ سمجھ لینا۔''

ایک عورت چونی کا عرق گاؤزبان لینے آگئی۔ حکیم کی تقریر کا تار ٹوٹ گیا۔ اس نے گلاس میں عرق ڈال کر عورت کو دیا اور صافی سے ہاتھ پونچھ کر جیب میں سے ایک روپیہ نکالا اور طوفے کی طرف بڑھا کر کہا۔

''تم ذرا اکبری منڈی تک جاؤ اور چونی کی چنن بوٹی۔ تین آنے کے موٹے عناب' دو آنے کا نوشادر اور ٹھیکری اور ایک

چھٹانک مال کی کنگنی لے آؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور ہاں واپسی پر سبزی کی منڈی سے ایک موٹا سا لیموں بھی لیتے آنا۔''

طوفا ایک سعادت مند شاگرد کی طرح اٹھا۔ حکیم سے روپیہ لے کر جیب میں رکھا۔ جوتے پہنے۔ کمبل بدن کے گرد اچھی طرح لپیٹا اور گلیوں گلی اکبری منڈی کی طرف روانہ ہوگیا۔

پرسی رات ڈھائی بجے تک اپنی دکان میں گیتا بالی کے بورڈ پر کام کرتا رہا صبح اس کی آنکھ کھلی تو نو بج رہے تھے۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ بورڈ دکان سے نکلوا کر تانگے میں لدوایا اور سینما کی طرف روانہ ہوگیا۔ منیجر اس وقت ٹکٹوں کی گڈیاں میز پر رکھے رجسٹر پر حساب کتاب لکھ رہا تھا۔ پرسی کو دیکھ کر باہر آیا۔ بورڈ کو غور سے دیکھا۔ گیتا بالی کی ناک پر انگلی رگڑ کر انگلی کو غور سے دیکھا۔

''رنگ ابھی گیلا ہے۔''

''رات دو بجے تو اسے ختم کیا ہے۔ ساری رات کام کرتا رہا ہوں۔''

''ہوں۔''

اتنا کہہ کر منیجر پھر کمرے میں چلا گیا۔ اور حساب کتاب میں مصروف ہوگیا۔ پرسی کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ وہ بے چین تھا۔ اسے پورے دس بجے ایلس کو لے کر گھر جانا تھا اور اس کے بعد اسے لارنس کی سیر کروانی تھی۔ چڑیا گھر دکھانا تھا۔ ہوٹل میں کھانا کھلانا تھا۔ اس پروگرام کے لئے پیسوں کی ضرورت تھی اور منیجر پیسوں کی کوئی بات ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے ہزاروں کے حساب کتاب میں لگا تھا۔ آخر پرسی سے نہ رہا گیا۔ اس نے پہلو بدل کر کہا۔

''میرا ابھی حساب کر دیں۔ مجھے ذرا جلدی ہے۔''

منیجر پانچسو کو پانچ سے ضرب دیتے ہوئے بولا۔

''آج تو اتوار ہے۔''

''اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ حساب جلدی کر دیں۔ اتوار ہی تو ہمارا خاص دن ہوتا ہے۔''

منیجر نے دراز میں سے ایک کاپی نکال کر کھولی اور اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے بولا۔

''تمہارا ایڈوانس کتنا تھا؟''

''پچیس روپے۔''

منیجر نے ایک صفحے پر پچیس روپے پرسی کے نام کے آگے لکھے ہوئے دیکھے اور کاپی بند کر کے دراز میں رکھ لی۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے بیس روپے باقی ہیں۔"

"جی ہاں بیس۔"

"تو بھائی آج تو اتوار ہے۔کل لے جانا۔"

پرسی کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔کل وہ بیس لے کر کیا کریگا۔روپوں کی تو غریب آدمی کو ہر وقت ضرورت رہتی ہے لیکن اگر ضرورت کے وقت روپے نہ ملیں تو بھاڑ میں جائے ایسی محنت مزدوری۔۔۔۔۔۔۔۔پرسی کے لئے اگلے روز بیس روپوں کی قیمت محض بیس پیسے تھی۔مگر آج وہ دو ہزار سے بھی بڑھ کر تھے۔کیونکہ آج ان بیس روپوں نے ایلس کو کھینچ کر اس کے پاس لانا تھا۔پرسی کو چار گھنٹے ایلس کی سنگت میں رکھنا تھا۔اسے ایلس کے خوبصورت بالوں پر ہاتھ پھیرنے کا موقع دینا تھا۔

"نہیں نہیں منیجر صاحب باقی حساب آج ہی چکا دیں۔کل مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو پرسی!تمہیں کل بھی ان کی ضرورت ہوگی۔"

"مجھے آج ضرورت ہے جناب۔بڑی سخت ضرورت ہے۔"

"تو پھر ایسا کرنا دوپہر کے شو پر آ کر لے جانا۔"

"جناب مجھے ابھی آدھ گھنٹہ بعد ان روپوں کی ضرورت ہے۔اگر آپ انتظام کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔"

"اگر تم مجبور کرتے ہو تو میں اپنی جیب میں سے تمہیں ادا کئے دیتا ہوں۔"

منیجر صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ روپے نکالے اور انہیں گن کر پرسی کی طرف بڑھا کر بولا۔

"تمہاری قسمت کے صرف پندرہ روپے ہی نکلے ہیں۔ابھی ان سے کام چلاؤ۔باقی دوپہر کو آ کر لے جانا۔"

پرسی کو سورج بادلوں میں سے باہر نکلتا دکھائی دیا۔اس نے جلدی سے پندرہ روپے لے کر جیب میں رکھے اور سلام کر کے باہر نکل آیا۔اس نے وہیں سے رکشا لیا اور سیدھا ایلس کے ہاں پہنچ گیا۔ایلس اپنے مکان کے کوٹھڑی نما کمرے میں چارپائی پر بالکل تیار بیٹھی چائے پی رہی تھی۔

پرسی ایلس کو لے کر پہلے گرجا گھر گیا۔وہاں عبادت کی۔پھر لارنس کی سیر کروائی بعد میں چڑیا گھر میں گھومتے رہے اور کھانے کے وقت وہ اسے لے کر لاہور ہوٹل آ گیا۔ایلس کالے رنگ کی دبلی سی لڑکی تھی جس کے نقش بڑے تیکھے تھے پرسی اس کا متوالا ہو رہا

تھا۔ کیبن میں بیٹھا اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ کبھی میز کے نیچے سے اس کا گرم گرم ہاتھ تھام لیتا اور کبھی ایک گہری آہ کھینچ کر چپ ہو رہتا ایلیس نے کھانے کو بہت کچھ منگوا لیا۔ پرسی کو بل کی فکر پڑ گئی اس کے پاس کل دس روپے باقی رہ گئے تھے۔ اس نے غسل خانے جانے کے بہانے باہر آ کر بیرے کے کان میں کہا کہ بل نو روپے سے اوپر نہ بڑھنے پائے اور سیٹی بجاتا واپس کیبن میں آ کر ایلس سے محبت کی باتیں کرنے لگا۔

ایلس نے کہا۔

''میں آئس کریم ضرور کھاؤں گی ڈارلنگ۔ میں نے سنا ہے یہاں کی آئسکریم بہت اچھی ہوتی ہے۔''

''کیوں نہیں۔ ضرور کھاؤ۔ لیکن میرا خیال ہے سردیوں میں یہ آئس کریم نہیں بناتے۔

ایلس نے ڈبل روٹی کے ٹکڑے پر قیمے کی تہہ جما کر اوپر چقندر کے قتلے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مال روڈ کے سارے ہوٹل سردیوں میں آئس کریم بناتے ہیں۔ ابھی میں نے پرسوں وکٹر کے ساتھ ڈیل مونٹی میں آئس کریم کھائی تھی۔''

وکٹر کے نام پر پرسی کا دل جل کر کباب ہو گیا۔ ایلس نے اس کے سامنے اس کے رقیب کی تعریف کی تھی۔ وہ کیبن سے اٹھ کر باہر آیا۔ بیرا اس کا واقف تھا۔ اس نے اسے بلا کر کہا۔

''دیکھو بھائی! تم بھی مزدور ہو اور میں بھی مزدور ہوں۔ محبت تم نے بھی کی ہوگی اور محبت میں بھی کر رہا ہوں پیسوں کی قلت تمہیں بھی ہوئی ہوگی اور پیسے نہ ہونے کا ماتم میں بھی کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں میرا بل پورا ہو چکا ہے مگر میں ایلس کو آئسکرم ضرور کھلانا چاہتا ہوں۔ کیا تم ایسا نہیں کر سکتے کہ دو آئس کریم اپنے نام سے ہمیں کیبن میں بھجوا دو؟ میں کل تمہیں ان کی پے منٹ کر دوں گا۔''

بیرا مسکرایا اور اپنے سفید کوٹ کے بٹن کو رومال سے چمکاتا ہوا بولا۔

''کیوں نہیں ہو سکتا بادشاہو! جی جی چاہے اپنے معشوق کو کھلاؤ۔ پیسے آتے رہیں گے۔ ہم تو عاشقوں کی قدر کرتے ہیں۔''

''شکریہ دوست۔''

پرسی مسکراتا ہوا کیبن میں آیا اور سگریٹ کا کش لگا کر بولا۔

''آ رہی ہے آئس کریم۔''

''ونڈر فل۔''

''کچھ اور کھاؤ گی ایلس؟''

پرسی کو ادھار کی شہ مل گئی تھی۔ اب وہ ایلس کو سارا لاہور ہوٹل کھلا دینا چاہتا تھا۔

''ایک پلیٹ پوٹیٹو چپس اور بنوالو۔''

''شیور! شیور! بیرا۔۔۔۔۔۔۔۔ایک پٹیٹو چپس لے آؤ۔''

پرسی اپنی ننھی سی جان لڑا کر بھی ایلس کے دل سے کمینے وکٹر کا خیال نکال دینا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اگر اپنی ساری دکان' دکان کا سارا سامان سارے برش' رنگوں کے ڈبے اور بستر وغیرہ بھی بیچ دیتا تو وکٹر کی جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ کیونکہ وکٹر ایک دفتر میں تین سو روپے کا ماہوار پر ملازم تھا اور خوب رشوت لیتا تھا۔ وہ ایلس کو بڑے مزے کرواتا تھا ایلس تو محض کبھی کبھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے پرسی کے ساتھ آجاتی تھی۔ مگر ایلس نے پرسی کو کبھی یہ وہم نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ وکٹر سے پیار کرتی ہے۔ وہ پرسی کے پاس بیٹھ کر اسی کے گن گاتی۔ اسے محبت کی تیز تیز گہری نظروں سے دیکھتی اور بار بار مسکرایا کرتی۔ اس کی کالی کالی آنکھیں غضب کی موہنی تھیں۔ پرسی کا دل ہل جاتا۔

''ہائے ہائے کیا بلا کی لڑکی ہے۔'' وہ یاقوت سے کہا کرتا تھا۔ ''جی چاہتا ہے اسے کوٹ کی اندر والی جیب میں چھپا کر رکھ لوں اور کبھی ہوا نہ لگنے دوں اسے تصویر بنا کر دیوار سے لٹکا دوں۔ اس کی ربڑی بنا کر کھا جاؤں۔ ہائے ہائے!''

مگر ایلس بڑی ہوشیار لڑکی تھی۔ وہ بیک وقت تین چار عیسائی لڑکوں سے فلرٹ کر رہی تھی اور پلو کسی کو بھی نہ پکڑاتی تھی۔ وکٹر' پرسی' جارج' اور پیڈرو۔۔۔۔۔۔۔ یہ سب اس کالی تیکھی اور دلکش لڑکی کو دام میں پھانسنے کی فکر میں تھے اور وہ ان سب کا دانہ چگ کر اڑ جاتی تھی۔ پرسی غریب کا جال تو اس قدر معمولی تھا کہ ایلس اسے بڑی آسانی سے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیتی اور بڑے مزے سے دانہ کھا جاتی۔ باقی عاشق اسے ہر روز سیریں کرواتے اور سینما دکھاتے پھرتے۔ پرسی تو صرف اتوار کے اتوار اسے ہوٹل میں کھانا کھلاتا تھا۔ اس کے لئے بھی اسے بیروں سے ادھار کرنا پڑتا تھا۔ جس وقت وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکلے انہیں سامنے فوٹو گرافر کی دکان کے باہر یاقوت کھڑا دکھائی دیا۔ ایلس اسے جانتی تھی۔ وہ دونوں اسے بڑھ کر ملے۔ یاقوت نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا اور بڑے مزے سے پیپل کے درخت کے نیچے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔

''کسی کا انتظار ہو رہا ہے لالہ؟''

''بس یونہی کھڑا ہوں۔ موسم کا لطف اٹھا رہا ہوں۔''

''اٹ ازلولی! اٹ از ونڈرفل مسٹر یاقوت۔'' ایلس نے چہک کر کہا۔

''تم لوگ کہاں جارہے ہو؟''

''میں ذرا ایلس کو گھر تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ چلو گے تم بھی؟''

''نہیں میں ذرا یہیں ٹھہروں گا۔ تم جاؤ۔''

''بائی بائی''

''بائی بائی''

ایلس اور پری چلے گئے۔ یاقوت وہیں کھڑا رہا۔ دراصل یاقوت وہاں ایک سیاہ برقع پوش کے لئے کھڑا تھا۔ جس کی شلوار سفید ساٹن کی تھی۔ پاؤں میں سفید گرگابی تھی اور جو ابھی ابھی یاقوت کے قریب سے ہو کر سڑک عبور کر کے سامنے والے فٹ پاتھ پر مخالف سمت کو جا رہی تھی۔ یاقوت وہاں سگریٹ لینے کے لئے رکا تھا کہ قلعہ گوجر سنگھ والی سڑک سے ایک لڑکی باہر آئی۔ ریشمی سنجاف والا برقع ساٹن کی سفید شلوار۔ سفید گرگابی۔ اس کی چال میں قدرے تیزی اور گھبراہٹ سی تھی۔ جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس قسم کی لڑکی خواہ مخواہ دل میں تشویش پیدا کر دیتی ہے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے غور سے یاقوت کو دیکھا۔ نقاب کی باریک جالی میں سے یاقوت کو دو چمکتی ہوئی آنکھیں دکھائی دیں۔ پھر اس نے نقاب کی آڑ میں سے ایک سفید ابریشمی گال اور جھولتا ہوا آویزہ دیکھا۔ یاقوت وہی رک گیا۔ لڑکی کی ایڑیاں گلابی تھیں لیکن جب ان پر پورے جسم کا بوجھ پڑتا تو سفید ہو جاتی۔ یہ لڑکی چوک عبور کر کے سامنے والے فٹ پاتھ پر آ گئی اور سٹیشن کی طرف چلنے لگی۔ جس وقت یاقوت ایلس اور پری سے باتیں کر رہا تھا وہ لڑکی ٹیکسی سٹینڈ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پیشتر اس کے کہ کوئی ڈرائیور اسے ساتھ چلنے کی دعوت دے وہ دوسری بار چوک عبور کر کے پرانے قلعہ گوجر سنگھ کے چوک میں آ گئی اور پھلوں کی دکان کے آگے پیپل کے درخت تلے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اب ایلس اور پری جا چکے تھے۔

یاقوت وہاں سے چل کر اس لڑکی سے کوئی چھ سات فٹ کے فاصلے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی کچھ بے چین سی تھی۔ وہ اپنے نازک سرخ سپید ہاتھ باہر نکالے انگلیاں بھینچ رہی تھی۔ اس کی کلائیوں میں کانچ کی سیاہ رنگ کی چوڑیاں تھیں یاقوت کا دل دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے ایک گہری نگاہ یاقوت پر ڈالی۔ اس نگاہ کی تیزی اور اعتماد کو یاقوت نے بھی محسوس کیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ نقاب کے اندر مسکرا دی ہو۔ یاقوت کا چہرہ گرم ہو گیا۔

کیسی رسیلی نار

کرسولہ سنگا

مکھ موڑ مسکات جات

اس کے ذہن میں مالکونس کے بول گونجنے لگے اور پام کے جنگلوں میں جنوبی ہند کی رسیاں بانٹنے والی بھیل عورتیں ماتھوں پر سرخ تلک لگائے رقص کرنے لگیں رقص کی لے بڑھتی گئی۔ تال سمٹتی گئی اور سیاہ چشم بھیلنیاں کتھا کلی کے پر اسرار اشاروں اور چھوٹے چھوٹے دائروں میں تبدیل ہوتی گئیں۔ یاقوت کو اس لڑکی پر جنوبی ہند کی بھیلنی کا شبہ ہوا۔ یہ تنجور کے مندروں' سلہٹ کے چائے کے باغوں اور کرنافلی کے بانس کے جنگلوں میں سے نکل کر اسے ملنے قلعہ گوجر سنگھ کے چوک میں آ ئی تھی۔

کہیں یہ ٹیکسی تو نہیں؟ اشاروں سے پیچھے لگا کر بعد میں بھاؤ طے کرنے والی فاحشہ عورت تو نہیں؟ یاقوت کو ایسی عورتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ لڑکی چند لمحے وہاں کھڑے رہنے کے بعد نکلسن روڈ کی طرف پیدل چل پڑی۔ یاقوت بھی اس کے پیچھے ہولیا۔ رات بھر کی بارش کے بعد آج سارا دن ہوا چلتی رہی تھی۔ جس کی وجہ سے بڑی سڑکوں پر کیچڑ جم گیا تھا۔ چوک میں پہنچ کر وہ لڑکی سٹیشن کی طرف مڑ گئی۔ یاقوت اس کے عقب میں تھوڑے فاصلے پر ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس نے لڑکی کو آہستہ سے آواز دینا چاہا۔ مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا اور پیچھے پیچھے چلتا گیا۔ ایمپرس روڈ ختم ہوگئی۔ سٹیشن آ گیا۔ لاہور کا بارونق سٹیشن!

لڑکی سٹیشن کی طرف مڑ گئی۔ سٹیشن کی لابی میں پہنچ کر اس نے ایک پلیٹ فارم خریدا اور سیڑھیاں چڑھ کر پل پر سے ہوتی پانچ نمبر پلیٹ فارم پر جا کر ٹہلنے لگی۔ یاقوت بھی اسی پلیٹ فارم پر ذرا ہٹ کر ٹہلنے لگا۔ لڑکی نے دو تین بار یاقوت کو دیکھا۔ پھر گردن اٹھا کر ٹہلنے لگی۔ پلیٹ فارم پر اس وقت کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی۔ وہاں دو ایک آدمی سٹال پر کھڑے رسالے دیکھ رہے تھے۔ یاقوت نے لڑکی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس کی طرف بڑھا۔ لڑکی ایک طرف چل پڑی۔ یاقوت دو ایک قدم ذرا اور تیز اٹھا کر اس کے برابر میں آ گیا۔ اسے اب لڑکی کے لباس کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔

''ابھی کہاں تک چلنا ہے آپ کو؟''

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ سست کر چلنے لگی تھی۔

''میں تو بہت تھک گیا ہوں۔''

لڑکی خاموش رہی اور چلتی گئی۔ پانچ نمبر پلیٹ فارم ختم ہوگیا۔ لڑکی چار نمبر کی طرف مڑ گئی۔ یاقوت نے کہا۔

''آیئے ایک پیالی چائے پی لیں۔ سردی بہت ہوگئی ہے۔ یوں کب تک اس ٹھنڈ میں مارے مارے پھرتے رہیں گے؟''

''جی نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

لڑکی پہلی بار بولی تھی۔ اس کی آواز ناک اور گھنٹی ایسی تھی۔ اس گھبرائی ہوئی مترنم آواز میں اس کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دے رہی تھی۔

''تو پھر آیئے کسی اچھی اور محفوظ جگہ چلے چلتے ہیں۔ آیئے۔''

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا اور یاقوت کے ساتھ ہولی۔ یاقوت اسے لے کر سٹیشن سے باہر نکل آیا۔ باہر آ کر اس نے ایک ٹیکسی لی۔ دروازہ کھولا۔ لڑکی کچھ ہچکچائی پھر چپکے سے جھک کر اندر داخل ہوئی اور کونے میں لگ کر بیٹھ گئی یاقوت اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''شیزان چلو۔''

ٹیکسی مال روڈ کی طرف روانہ ہوگئی۔ سارا رستہ دونوں میں سے کسی نے بھی کوئی بات نہ کی۔ شیزان کے سامنے ٹیکسی آ کر ٹھہر گئی۔ یاقوت اس لڑکی کو لے کر شیزان میں آ گیا دونوں اوپر گیلری میں جا کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''کافی۔۔۔۔۔۔۔''

بیرا آرڈر لے کر نیچے اتر گیا۔

''نقاب اٹھا لیجئے۔ یہاں غیر کوئی نہیں ہے۔''

لڑکی نقاب ڈالے رہی۔ یاقوت نے جیب سے ڈبیا نکال کر میز پر رکھ دی۔ سگریٹ سلگایا اور جالی دار پردے میں سے نیچے دیکھنے لگا۔ لڑکی نقاب کے اندر سے اسے بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کافی آ گئی۔ یاقوت نے کافی بنائی اور لڑکی کے آگے پیالی کھسکاتے ہوئے مسکرایا۔

''اگر آج کے بعد ہمارے تعلقات استوار ہو گئے اور ہم زندگی کی آخری سرحدوں تک ایک دوسرے کے دوست رہے تو ہمیں یہ لمحے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ جبکہ آپ نے نقاب نہیں اٹھائی اور میں نے آپ کی شکل نہیں دیکھی۔ یہ وہ گھڑی ہے کہ سکہ ٹاس کے لئے فضا میں اچھالا جا چکا ہے اور ابھی زمین پر گرا نہیں ہے۔ کیا خبر میم آئے کہ زنجیر! شوق' تشویش' دبدا اور حیرت کے یہ انمول اور دلچسپ ترین لمحات ہیں۔ اگر ہم دلہا دلہن ہوتے تو یہی مرحلہ ہمیں حجلہ عروسی میں پیش آتا۔ لیکن ہم شیزان کی گیلری میں بیٹھے کافی پی رہے ہیں۔ زندگی ہمیشہ سٹیج بدل لیتی ہے۔ کھیل کبھی نہیں بدلتی۔''

گیلری میں اور کوئی جوڑا نہیں تھا۔ فضا بڑی گرم اور پر سکون تھی جس میں کافی کی خوشگوار تلخ مہک رچی ہوئی تھی۔ یاقوت کے

اصرار پر لڑکی نے نقاب اٹھادی اور سر جھکالیا۔لڑکی واقعی بڑی خوبصورت تھی۔ سرخ وسپید رنگ' بڑی بڑی پیاری آنکھیں کھلا ماتھااور آلو چے ایسے ہونٹ۔لیکن اس حسن پر اداسی چھارہی تھی۔گلاب کا شگفتہ پھول کچھ کچھ مرجھا رہا تھا۔یاقوت اس حسن سوگوار سے بے حد متاثر ہوا۔

''میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔''

''کیا کریں گے نام پوچھ کر؟''لڑکی نے کافی کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اسے ہمیشہ یادرکھوں گا۔''

لڑکی ذراسی مسکرائی۔مگر اس مسکراہٹ میں بھی اداسی تھی۔

''کلثوم''

یاقوت نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

''جتنی مترنم آپ کی آواز ہے اتنا ہی مترنم نام بھی ہے اگر میں آنکھیں بند کر کے آپ کا نام بار بار دہراؤں تو مجھے یوں محسوس ہوگا جیسے بہت دور کوئی قافلہ گزر رہا ہے اور اس کی ڈاچیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں آرہی ہیں۔''

پھر اس نے کافی کی دوسری پیالی بناتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

''ہمیں پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے بارے میں اتنا کچھ معلوم نہیں کر لینا چاہئے کہ پھر جاننے کو کچھ باقی نہ رہے۔لیکن میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کلثوم! کہ تم گھر سے کس کی تلاش میں نکلی تھیں۔میں نے تمہیں ''تم'' سے مخاطب کیا ہے۔برا نہ مان جانا میں تمہیں اب اسی طرح مخاطب کروں گا۔''

کلثوم نے اپنے ننھے سے رومال کے ساتھ ہونٹوں پر لگی ہوئی کافی کی نمی خشک کی اور پہلی بار یاقوت کی طرف اپنی بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر روشن صاف اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''پہلے آپ بتایئے کہ آپ کس لئے میرے پیچھے چل پڑے تھے۔''

''یہ تم نے بڑا دلچسپ سوال کیا ہے۔''

گیلری کی پرسکون فضا میں تھری کیسل کی مہک کافی کی خوشبو سے بغل گیر ہو رہی تھی۔یاقوت نے کافی کا گرم گرم گھونٹ پی کر تھری کیسل کا تازہ سگریٹ سلگا کر کہا۔

''واقعی یہ بڑا دلچسپ سوال ہے کہ میں کس لئے تمہیں دیکھ کر تمہارے پیچھے چل پڑا۔ حالانکہ مجھ سے تمہاری کوئی جان پہچان نہ تھی۔ ہم ایک دوسرے سے پہلے کبھی نہ ملے تھے۔ میں تمہارے لئے اجنبی تھا۔ تم میرے لئے اجنبی تھیں۔ آخر میں نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟ تم یہی پوچھنا چاہتی ہو ناں؟''

کلثوم بڑی توجہ سے اس ابھرے بدن کے پختہ صورت' چمکیلی آنکھوں والے اور پکے ہوئے بالوں والے آدمی کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں۔''

یاقوت نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگایا۔ آنکھیں بند کر کے ایک گہرا سانس لیا اور پھر آنکھیں کھول کر کلثوم کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے چھوٹے چھوٹے دانتوں کے درمیان زیادہ پان کھانے کی وجہ سے گہری لکیریں پڑ گئی تھی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں کلثوم کو ان لوگوں کی یاد دلا رہی تھیں جنہیں اس نے اکثر خواب میں گھوڑے دوڑاتے' قلعوں کی دیواریں پھاندتے اور اونچی اونچی چٹانوں سے سمندروں میں چھلانگیں لگاتے دیکھا تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز اس قدر گہرا' پر اثر اور دل میں کھب جانے والا تھا کہ کلثوم کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس آدمی کو بڑی دیر سے جانتی ہے۔

''سب سے پہلے تمہاری گھبرائی ہوئی چال نے میرے اندر تمہارے بارے میں ایک تجسس پیدا کیا۔ یوں لگتا تھا تم کسی کی تلاش میں ہو اور جس کی تلاش میں ہو وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔ تم نے چوک عبور کیا۔ فٹ پاتھ پر الٹے رخ تھوڑی دور گئیں۔ پھر تم نے مجھے گہری نظر سے دیکھا۔ دوسری چیز جس نے مجھے تمہارے تعاقب پر مجبور کیا وہ تمہاری سفید ساٹن کی شلوار تھی جو ہوا کی لہروں کے ساتھ ساتھ چاندی ایسی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ پھر تمہارے نقاب کی اوٹ سے تمہارے رخسار کی ایک جھلک اور کان میں جھولتا ہوا آویزہ اور پھر تمہاری دودھ ایسی ایڑیاں۔۔۔۔۔۔۔ جنہوں نے اتنی خوبصورت اور قیمتی امانت اٹھا رکھی تھی۔ اب بتاؤ میں بے اختیار ہو کر تعاقب نہ کرتا تو کیا کرتا۔ میں سچ کہتا ہوں کلثوم اگر میں وہیں کھڑا رہتا اور تم سڑک پر میری نگاہوں سے اوجھل ہو جاتیں تو میں آپ کو کبھی معاف نہ کرتا۔ شاید میں زندگی بھر پچھتاتا رہتا اور ایک ایسے ذہنی عذاب میں مبتلا ہو جاتا جس کی وجہ میری بزدلانہ شرافت ہوتی۔ جب کبھی تمہاری پھول ایسی ایڑیوں' تمہارے رخسار اور جھولتے آویزے کا خیال آتا۔ میں تڑپ کر رہ جاتا اور سوچا کرتا کہ اب اگر تم کہیں دکھائی دیں تو میں تمہیں ضرور پکاروں گا۔ لیکن پھر تم کبھی مجھے نہ ملتیں۔ دوبارہ تمہاری صورت دیکھنا نصیب نہ ہوتی۔''

کلثوم چپ بیٹھی یاقوت کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ شخص ایک منٹ سے پہلے اس کے لئے اجنبی تھا۔لیکن اس کی دھیمی دھیمی' میٹھی میٹھی اثر کرنے والی باتوں نے کلثوم کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا اور وہ اپنی پریشانی بھی بھلا بیٹھی تھی۔ بیرا گرم گرم تازہ کافی چھوڑ گیا تھا۔

''اور کافی بناؤں کلثوم؟''

''جی ہاں''

یاقوت پیالی میں تازہ مہک بھری گرم کافی ڈالنے لگا۔

''زندگی بڑی عجیب اور دلچسپ چیز ہے کلثوم۔۔۔۔۔۔۔ہم سینکڑوں ایسے چہرے دیکھتے ہیں جن سے اگر ہماری شناسائی ہو گئی ہوتی تو ہماری زندگیاں یکسر مختلف ہوتیں۔ ہم خدا جانے اس وقت کہاں اور کس جگہ بیٹھے زندگی بسر کر رہے ہوتے۔لیکن ہم ان چہروں سے بالکل واقف نہیں ہیں۔ ہم ان لوگوں کے نام تک نہیں جانتے۔ ابھی ایسے ہزاروں چہرے گمنامی کے پردے میں چھپے ہیں جنہیں ہم نے دیکھا تک نہیں لیکن جن سے اگر ہمارے تعلقات استوار ہو جاتے تو ہم آج یہاں شیزان گیلری میں بیٹھے کافی پینے کی بجائے آپس کی برف پوش ڈھلانوں پر سکیٹنگ کر رہے ہوتے۔تم جاپان کے کسی گرم چشمے پر اپنے بچے کو ساتھ لئے نہا رہی ہوتیں اور میں مدارس کے کسی دفتر میں کلرکی کر رہا ہوتا اور یا اطالیہ کے کسی باغ میں کھڑا انگوروں سے بھرے ہوئے کریٹ اٹھا اٹھا کر ٹرک میں لاد رہا ہوتا۔ یہ تو زندگی کے اتفاقات ہیں اور سنجوگ ہیں۔۔۔۔۔۔۔کیا تم ان باتوں پر یقین رکھتی ہو کلثوم؟''

کلثوم نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے اپنی پیالی میں چمچ ہلاتی رہی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں پر دراز پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی کالی چوڑیاں کہیں کہیں سے روشنی میں چمک رہی تھیں۔ گرم فضا میں خوشگوار کافی پینے کے بعد اس کے بھرے بھرے آلوچے ایسے ہونٹوں پر جھلملاہٹ سی آ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ اس قدر دلکش اور انگلیاں اتنی نازک اور ستواں تھیں کہ معلوم ہوتا تھا قدرت نے انہیں صرف پھول توڑنے کے لئے بنایا ہے۔ اگر ان انگلیوں میں مصور کا برش تھما دیا جاتا تو وہ دنیا کی کلاسیک تصویر بنا سکتی تھیں۔ انسان کی تقدیر میں خوش نصیبی کی گھڑیاں لکھنے والے ہاتھ بھی یقیناً اتنا ہی خوبصورت ہوگا۔

یاقوت کافی کا ہلکا سا گھونٹ لے کر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑی گھلاہٹ اور گرمی تھی۔ کلثوم کو اس کے سانس کی پر اسرار سرگوشی نما پھنکار سی سنائی دی۔ اس کے کانوں کی ویں سینک دینے لگیں۔ یہ کیسا عجیب آدمی تھا۔

''اب تم بتاؤ کہ تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں تھیں؟ تم کس کی تلاش میں تھیں؟ تمہیں کہاں جانا تھا؟ تم کہاں سے آئی تھیں؟''

کلثوم نے اپنے پرس میں سے لیڈیز گھڑی جس کا فیتہ نہیں تھا نکال کر وقت دیکھا اور نقاب کا فیتہ باندھنے لگی۔

''بڑی دیر ہوگئی۔ مجھے گھر جانا ہے۔''

''کیا تم میری بات کا جواب نہ دو گی کلثوم؟''

کلثوم نے کوئی جواب نہ دیا۔ فیتہ باندھ کر اس نے گہرا سانس لیا۔ بڑی اداس نظروں سے پردے کی جالی میں سے نیچے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

''اگر کبھی وقت آیا تو ان باتوں کا جواب ضرور دوں گی ابھی اس کی ضرورت نہیں۔''

یاقوت نے بل ادا کیا۔ سگریٹ جیب میں رکھے اور کلثوم کو ساتھ لے کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔ آسمان پر بادل پھٹ گئے تھے اور پھیکی پھیکی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ یاقوت نے ٹیکسی منگوائی۔

کلثوم نے کہا۔

''میں اکیلی ہی گھر جاؤں گی۔ آپ دوسری گاڑی میں چلے جایئے گا۔''

''بہت اچھا۔''

کلثوم ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ یاقوت نے پوچھا۔

''کیا پھر کبھی ملاقات ہوگی کلثوم؟''

کلثوم نے گہری نگاہوں سے یاقوت کو دیکھا اور بولی

''شاید''

یاقوت نے کلثوم کے منع کرنے پر بھی دو روپے ٹیکسی والے کو دے دیئے کلثوم نے کچھ عجیب حیران اور ملال بھری نظروں سے آخری بار یاقوت کو دیکھا اور ٹیکسی اسے لے کر آگے بڑھ گئی۔

جس وقت یاقوت اپنے ہوٹل پہنچا دن کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ کاؤنٹر پر اس کے نام کا ایک خط آیا ہوا تھا۔ اسلام پور سے بھابی نے لکھا تھا کہ آپ لاہور ایسے گئے کہ پلٹ کر کسی کی خبر بھی نہ لی۔ بچے یاد کرتے ہیں بھائی اکثر آپ کا پوچھتے رہتے ہیں۔ لاہور اور اسلام پور میں کوئی اتنا زیادہ فاصلہ تو نہیں ہے۔ آپ دن میں ایک بار مل کر پھر واپس جا سکتے ہیں۔ آخر میں لکھا تھا کہ نجمہ کی

اپنے پھوپھی زاد بھائی اصغر سے شادی طے ہوگئی ہے۔ فروری کی سات تاریخ کو بیاہ ہے۔ یاقوت نے سارا خط اپنے کمرے تک آتے آتے سیڑھیوں میں ہی پڑھ لیا۔ نجمہ کے بیاہ کا پڑھ کر اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس نے فوراً سر جھٹک دیا۔ تالا کھول کر اپنے کمرے میں آیا۔ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے بستر پر سگریٹ سلگا کر لیٹ گیا اور خط کی وہ سطریں دوبارہ پڑھنے لگا جہاں نجمہ کی شادی کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس نے کھیتوں میں ایک برقع پوش سنہری بالوں اور نسواری آنکھوں والی لڑکی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ پھر اسے مکان کی نیم روشن سیڑھیوں میں دو چمکتی ہوئی گرم نسواری آنکھیں دکھائی دیں۔ میں اڑاتے تیز تیز سانسوں کے درمیان نقرئی سرگوشیاں سنائی دیں اور کمرہ حنا کی تیز خوشبو سے بھر گیا۔ یاقوت نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک قصباتی سٹیشن کا ویران پلیٹ فارم پھر گیا جہاں بے چینی سے ٹہلتے ہوئے وہ کسی لڑکی کا انتظار کررہا ہے اور بار بار گھڑی دیکھ رہا ہے اور پھر ریل گاڑی کی چیخ فضا میں بند ہوتی ہے اور وہ گاڑی میں اکیلا سوار ہے اور اس کی افسردہ آنکھوں میں آنسو ہیں اور وہ نجمہ کا ٹکٹ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک رہا ہے اور ٹکٹ کے پرزے ریل گاڑی کے ساتھ ساتھ اڑ رہے ہیں۔

یاقوت نے خط پرے پھینک دیا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور الماری میں سے اخروٹ کی لکڑی کا وہ بکس نکالا جس میں نجمہ کے محبت بھرے خطوط بند تھے۔ بکس کا ڈھکنا کھلتے ہی حنا کے باسی عطر کی دردانگیز اداس خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ یاقوت ایک پل کے لئے نجمہ کے خطوں کو دیکھتا رہا۔ جن کے اوپر پڑی ہوئی گلاب کی پنکھڑیاں خشک ہوکر نسواری ہوگئی تھیں۔ نجمہ کی آنکھوں کی مانند! اسے بکس میں نجمہ اپنی طرف دیکھتی ہوئی نظر آئی۔ یاقوت نے ایک خط اٹھایا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے کسی ٹھنڈی لاش کو ہاتھ لگا دیا ہو۔ اب اسے حنا کے عطر کی باسی خوشبو کافور کی بو میں بدلتی محسوس ہونے لگی۔ اسے ہر خط پر اپنی مردہ محبت کے کتبے کا گمان ہوا۔ اس نے محسوس کیا گویا وہ ایک بدنصیب خاوند ہے۔ اور کفن کا ڈھکنا اٹھا کر اپنی مردہ بیوی کا چہرہ دیکھ رہا ہے۔ اس نے جلدی سے بکس کا ڈھکنا بند کردیا اور سر جھکائے آنکھیں بند کئے وہیں بیٹھا رہا۔ اچانک کسی نے دروازے پر دستک دی۔

یاقوت چونکا۔ اس نے بکس الماری میں رکھ کر تالا لگایا اور دروازہ کھول دیا سامنے ہوٹل کا بیرا تھری کیسل کے دو پیکٹ میں رکھے کھڑا تھا۔

''سگریٹ بابوجی۔''

''اوہ۔۔۔۔۔۔۔ شکریہ!''

یاقوت کو خیال نہیں رہا تھا۔ وہ اوپر آتے ہوئے نیچے بیرے کو سگریٹ لانے کے لئے پیسے دیتا آیا تھا۔ یاقوت نے سگریٹ لے

کر میز پر رکھ دیئے کچھ دیر وہ یونہی کمرے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے گرم کپڑے پہنے۔ سر پر جناح کیپ رکھی اور کمرے کو تالا لگا کر نیچے اتر گیا۔ باہر آ کر اس نے چوک والی دکان سے پان کھایا۔ تازہ ڈبیا کھول کر سگریٹ جلایا اور حکیم کی دکان کی طرف چل پڑا۔

وہاں حکیم نہیں تھا۔ لڑکے نے بتایا کہ وہ طوفے چچا کے ساتھ پرسی کی دکان پر گئے ہیں۔ یاقوت وہاں سے پرسی کی دکان پر آ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ پھیکی دھوپ غائب ہو گئی تھی۔ بادلوں نے دوبارہ آسمان کو ڈھانپ لیا تھا۔ گلی میں بڑی سوگواری سرد اداسی پھیلی ہوئی تھی۔ روزمرہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ چھابڑی والے گزر رہے تھے۔ کھڑکیوں سے چھینکے لٹکائے جا رہے تھے۔ یاقوت نے سوچا کہ آج ساری رات وہ نظمیں لکھتا رہے گا۔

پرسی کی دکان کا دروازہ بند تھا۔ یاقوت نے پھٹے پر چڑھ کر دستک دی طوفے نے ذرا سا دروازہ کھول کر متوحش آنکھوں سے باہر دیکھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔

''کوئی نہیں حکیم جی! یاقوت ہے۔''

اندر پوری محفل جمی ہوئی تھی۔ چھت پر بلب روشن تھا۔ دکان کے دونوں روشندان آج پہلی بار کھلے ہوئے تھے۔ درمیان میں انگیٹھی دہک رہی تھی۔ طوفا کھرل میں کوئی دوائی کوٹ رہا تھا۔ پرسی اپنے فوجی سویٹر کی آستین چڑھائے پتیلی میں کوئی لیسدار چیز گھول رہا تھا۔ حکیم دری پر انگیٹھی کے پاس بیٹھا گود میں طب کی ایک بوسیدہ کتاب رکھے دانتوں سے ہونٹ کاٹتے ہوئے اس کا مطالعہ کر رہا تھا۔ یاقوت ان کے پاس ہی ایک بکس پر بیٹھ گیا۔ پرسی نے دانت نکال کر کہا۔

''لالہ! وہ ظالم ٹانک تیار ہو رہا ہے کہ بڈھا کھائے تو جوان ہو جائے۔ جوان کھائے تو آٹھ سال کا لڑکا بن جائے۔ ایک ماشہ تمہیں بھی کھلائیں گے۔ کیوں حکیم جی! ہائے ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔۔''

حکیم نے کتاب پر سے نظریں اٹھا کر یاقوت سے کہا۔

''بڑی مشکل سے نسخہ ملا ہے۔ یار میں تو جالینوس کی یہ کتاب پڑھ کر حیران ہو گیا ہوں۔ کس بلا کا آدمی تھا یہ۔ لکھتا ہے کہ آدمی اگر اس نسخے پر پورا عمل کرتے تو کبھی بوڑھا نہیں ہو سکتا۔''

یاقوت نے پوچھا۔

''پھر جالینوس بوڑھا ہو کر کیوں مر گیا؟''

پرسی کے ہاتھ رک گئے۔ اس نے آنکھیں مچکا کر کہا۔

''حکیم جی یہ پوائنٹ بڑا خطرناک ہے ویسے۔سوچنے کی بات ہے پھر اس ذات شریف کی ربڑی کیوں ہوگئی؟''

طوفا اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔اسے جالینوس کی بحث سے کوئی سروکار نہیں تھا۔وہ کھروں میں دھوائی گھوٹے جا رہا تھا۔حکیم نے اپنی عینک اتار کر قمیض کے دامن سے اس کے شیشے صاف کئے اور دوبارہ لگا کر بولا۔

''یہ تو حکمت کی باتیں ہیں یاقوت۔۔۔۔۔۔۔۔ہوسکتا ہے وہ خود اس پر عمل کرنا نہ چاہتا ہو۔ہوسکتا ہے اس نے عمل کیا بھی ہو اور جب تک زندہ رہا جوان رہا ہو۔ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

پرسی نے نعرہ لگایا۔

''ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔۔۔کیا بات کی ہے میرے حکیم نے۔''

اتنا کہہ کر وہ پھر لیسدار شے میں انگلیاں چلانے لگا۔حکیم نے کہا۔

''پرسی اب چھوڑ دو اسے۔تم لیموں مجھے دو۔''

''یہ رہا سرکار لیموں۔''

پرسی نے ایک ڈبے میں سے بڑا سا لیموں نکال کر حکیم کو دیا۔حکیم نے چاقو کی مدد سے لیموں میں تھوڑا سا شگاف کیا۔پھر جیب سے پرانے زمانے کا تانبے کا گول گول موٹا پیسہ نکال کر اس شگاف میں پورے کا پورا اندر گھسیڑ دیا۔اب اس نے لیموں پر دھاگا لپیٹنا شروع کیا۔جب لیموں پوری طرح دھاگے میں چھپ گیا تو دانتوں سے دھاگا کاٹ دیا۔

''پرسی پتیلی ادھر کرنا۔''

پرسی نے جو اس انوکھی کیمیا گری میں سب سے زیادہ دلچسپی لے رہا تھا جھٹ سے پتیلی آگے کر دی۔حکیم نے لیس دار شے کو انگلی سے چھو کر دیکھا۔

''بالکل ٹھیک''

یاقوت نے پوچھا۔

''یہ کیا شے ہے؟''

حکیم نے مسکرا کر کہا۔

''یہ چٹن بوٹی ہے۔اس میں چھ ماشے مالکنگنی بھی شامل ہے اس کی خاصیت یہ ہے کہ اگر اس کا سفوف بنا کر لوہے کی سلاخ پر

چھڑک دیں اور اس سلاخ کو دو روز تک ریت میں دبا رہنے دیں تو تیسرے روز لوہا ریت بن گیا ہوگا۔"

یاقوت ہنس دیا۔

"کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو حکیم۔"

"خدا کی قسم میں جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ راولپنڈی میں ایک حکیم نے منوں لوہا ریت کیا ہے۔ اس کی تو کمائی کا ذریعہ ہی یہ سفوف ہے۔ پرسی کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"میری تو انگلیاں جام ہو رہی ہیں۔"

طوفا کھرل پر جھکے جھکے بولا۔

"پیارے کشتہ بھی تو تم ہی کھاؤ گے۔"

اب حکیم دھاگے میں لپٹے ہوئے لیموں پر چنن بوٹی کا لیپ کرنے لگا۔ جب وہ مالٹے کے حجم کا ہو گیا تو اس پر کھرل میں سے سفید سفوف لے کر چھڑ دیا۔ پھر اس کے گرد کپڑے کی کترنیں لپیٹنی شروع کر دیں۔ جب لیموں چکوترے جتنا ہو گیا تو اس پر ایک بار پھر چنن بوٹی کا لیپ کیا۔ دوبارا کھرل کا سفوف چھڑکا گیا۔ پھر کترنیں لپیٹی گئیں۔ اس کے بعد کڑاہی میں سے گندھی ہوئی صاف چکنی مٹی لے کر اسے اچھی طرح چاروں طرف مل دیا گیا۔ یہاں تک کہ کترنیں مٹی کے تازہ لیپ میں گم ہو گئیں۔ اب اس پیڑے کو آگ کا سینک دیا جانے لگا۔ محفل میں سب کی نگاہیں مٹی کے اس پیڑے پر جمی ہوئی تھیں۔ جو کبھی بسنتی رنگ کا ایک لیموں تھا۔ حکیم کی عینک کے پیچھے مردہ آنکھوں میں بے پناہ تجسس آ گیا تھا۔ طوفے کی آنکھوں میں یقین کی دلچسپی تھی۔ پرسی کی نگاہوں میں حیرت تھی اور یاقوت محض تفریح طبع کے لئے یہ ساری کیمیا گری دیکھ رہا تھا۔ حکیم نے طوفے سے کہا۔

"ایک سگریٹ سلگا کر دینا یار۔"

طوفے نے جلدی سے بگلے کی ڈبیہ میں سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور حکیم کے منہ میں دے دیا۔ حکیم کڑچھے میں مٹی کا گولا رکھے اسے چمٹے سے ہلا ہلا کر کوئلوں کا سینک دے رہا تھا۔ سگریٹ کا کش لگا کر اس نے سگریٹ پرسی کو دے دیا اور یاقوت کی طرف دیکھ کر بولا۔

"آدمی کی کمر میں ایک ہڈی گردن سے لے کر پیٹھ تک جاتی ہے۔ اس میں حرام مغز ہوتا ہے۔ آدمی جب بچہ ہوتا ہے تو اس ہڈی کی نلی حرام مغز سے پوری کی پوری بھری ہوتی ہے۔ جوں جوں وہ جوان ہوتا جاتا ہے حرام مغز کم ہوتا جاتا ہے۔ شادی کے بعد یہ آدھا رہ

جاتا ہے اور بڑھاپے میں بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ طب والے کہتے ہیں کہ اسی حرام مغز میں آدمی کی روح ہوتی ہے۔''

پری نے تشویش سے پوچھا۔

''مگر حکیم جی اسے حرام کیوں کہتے ہیں؟ یہ مغز حرام ہوتا ہے؟''

حکیم نے فوراً کہا۔

''یہ مغز حرام نہیں ہوتا بلکہ حرام مغز ہوتا ہے۔''

''اچھا اب سمجھا'' پری نے اپنی سوکھی گردن ہلا کر کہا۔

''یوں کہو کہ اس نلی میں آدمی کی ربڑی ہوتی ہے۔''

حکیم نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''علم کی باتوں کا مذاق نہیں اڑایا کرتے۔ جب تیری نلی کی ربڑی ختم ہو گی اور تو ٹانگیں کھڑ کھڑاتا میرے پاس آئے گا۔ تب پوچھوں گا میاں کیا بھاؤ ہے دال کا۔''

اس اثنا میں گوے کی مٹی سوکھ گئی۔ حکیم نے بڑے غور سے اسے گھما پھرا کر دیکھا۔ مٹی سوکھ کر تڑخ گئی تھی۔ حکیم نے وہاں تازہ مٹی کا لیپ کر دیا اور پھر آگ کا سینک دیا جانے لگا۔ جب چوتھی بار تڑخنے کے بعد مٹی سوکھ کر ویسی ہی رہی تو حکیم نے طوفے سے کہا۔

''لو بھئی یہ پہلی منزل تو طے ہو گئی۔''

یاقوت نے پوچھا۔

''اب اس کا کیا ہو گا؟''

حکیم نے ہاتھ صاف کر کے سگریٹ لیا اور دری پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا اور بڑے اطمینان سے کش لگا کر بولا۔

''بس اب اسے سو من تھاپیوں کی آنچ دیں گے اور جب راکھ چمٹا ڈالیں گے تو نہ مٹی ہو گی نہ گولا ہو گا اور نہ لیموں ہو گا۔ نیچے تانبے کا پیسہ چھوٹے پتاشے کی طرح پڑا ہو گا۔ یہی تانبے کا کشتہ ہو گا۔۔۔۔۔۔۔ طوفے میاں تھاتھاپیاں چھت پر ڈلوا دیں ہیں ناں۔''

''ہاں جی۔ گجری ڈال گئی تھی۔''

''بس اب آنچ دینے کی ڈیوٹی تمہاری ہے۔''

''فکر نہ کرو استاد جی۔''

پرسی اب چرس کا سگریٹ بھر رہا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور گلی محلے میں شروع رات کا سرد ویران اندھیرا آیا تھا۔ پرسی نے ہتھیلی پر تمباکو میں گرم گرم چرس کی گولی مسلتے ہوئے پوچھا۔

''حکیم جی کوئی ہمارے لائق سیوا ہو تو بتاؤ۔''

''تم صبح دتے کمہار سے جا کر کہنا حکیم نے کہا تھا اپنی دوائی آ کر لے جائے۔''

''دوست بچن گورو مہاراج!'' پرسی بولا۔

یاقوت نے کہا۔

''میرا خیال ہے تم ایک بار پھر اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ دتا بوڑھا آدمی ہے۔ ہو سکتا ہے تانبے کا کشتہ ہضم نہ کر سکے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کشتہ پوری طرح تیار نہ ہو چکا رہے۔''

حکیم نے چٹکی بجا کر سگریٹ کا گل جھاڑا۔

''یاقوت لال! خدا کی قسم اگر انیس بیس کا بھی فرق رہ جائے تو اپنی انگلیاں کٹوا دوں۔ میاں ہمارے خاندان میں تو کشتہ مارنا بچوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے۔

میں نے امرتسر میں ایک بار بار کو مار دیا تھا۔ حالانکہ پارے کا کشتہ بنانا بے حد مشکل ہے۔ لیکن میں نے بنا لیا تھا اور نہال چند پٹواری کو کھلایا تھا۔ اس کا پرانا گھٹیا ایکی دن میں کھل گیا تھا۔ یہ تو جدی پشتی نسخے ہیں۔ کوئی مذاق تو ہے نہیں۔''

پرسی نے چرس بھر لی تھی اور اب وہ سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ طوفے نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا اور دوبارہ مفلر لپیٹتے ہوئے بولا۔

''استاد جی کبھی یاقوت کو بھی ایک ماشہ کشتہ کھلائیں۔''

حکیم نے یاقوت کی طرف دیکھا جو بکس پر بیٹھا بڑے مزے سے سگریٹ پی رہا تھا اور ذرا ذرا مسکرا رہا تھا۔

''اسے سونے کا کشتہ کھلائیں گے۔ یہ دماغی آدمی ہے سونے کا کشتہ اس کے دماغ کو تقویت بخشے گا۔ میاں یہ تو پیسے کا کھیل ہے۔ کشتہ جس دھات کا کہو تیار ہو جائے گا۔ اب تم کہو گے کہ میں گپ مار رہا ہوں۔ لیکن میں تمہیں علی بخش سنار کی گواہی دلوا سکتا ہوں۔ علی بخش زندہ ہے مرا نہیں۔ ایک روز میرے پاس آیا اور رو کر کہنے لگا۔ حکیم جی مر گیا ہوں۔ بیوی کے پاس جاتے شرم آتی ہے دوسری

شادی اس لئے کی تھی کہ اولاد ہوگی جو نام روشن کرے گی۔ لیکن اب۔۔۔۔۔۔۔۔"

پری نے چرس کی ترنگ میں آ کر بات مکمل کر دی۔

"اب اپنی ہی ربڑی ختم ہوگئی ہے۔"

حکیم۔ طوفا اور یاقوت ہنس پڑے۔ یاقوت نے کہا۔

"پری بیٹا! مزے میں آ رہے ہوناں!"

پری نے زور سے کش لگا کر دھواں اگلا اور دیوار کی طرف تھوک کر بولا۔

"ہائے ہائے! لالہ کچھ نہ پوچھو بس۔ ایک پنجابی کا بیت یاد آ گیا ہے۔ حکیم جی گستاخی معاف لکھا ہے کہ۔

توتا وے ہریا دلیا تیرے توت لمکدے کالے

ایتھوں دی کت لنگدے ڈھٹے بیبا لال صراحیاں والے

شہتوت کے ہرے بھرے درخت! تیری ٹہنیوں سے لٹکتے کالے کالے شہتوت کتنے بھلے لگتے ہیں۔

یہ بتا کہ تو نے یہاں سے کہیں ان لڑکیوں کو گزرتے دیکھا ہے جنھوں نے سروں پر لال صراحیاں اٹھا رکھی تھیں؟

"اچھا بیت ہے حکیم نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ علی بخش سنار نے جب اپنی رام کہانی سنائی تو میں نے کہا۔ علی بخش تو ایک کام کر انشاء اللہ اسی برس کی عمر میں بھی تو ہر سال ایک بچہ پیدا کرے گا۔ علی بخش نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ حکم کرو۔ میں نے اسے ایک کالا رنگ اور کالا مرغ منگوایا۔ دونوں کے پیٹ چھری سے چاک کئے اور گرم گرم پتے نکال کر تھالی میں آمنے سامنے رکھ دیئے۔ اب ایک تنکا لیا ہر پتے کا سیال مادہ تھوڑا تھوڑا لے کر اس تنکے کو ماشہ بھر ہرنولی کے تیل میں ہلا دیا۔ چھ روز علی بخش نے اس تیل کی مالش کی اور ساتویں روز وہ پورا مرد تھا۔ اس کے ہاں اب بچہ پیدا ہونے والا ہے۔"

طوفے نے جلدی سے لقمہ دیا۔

"استاد جی! وہ چراغ ماشکی والا قصہ بھی سنایئے۔"

"ارے بھائی کوئی ایک قصہ ہو تو سناؤں بھی۔۔۔۔۔۔۔آج کل تو جسے دیکھو رو رو کر بس ایک ہی کہانی سنا رہا ہے۔"

رات کو حکیم کے مکان کی چھت پر سوا من تھاپیوں کی آگ جلا کر درمیان میں مٹی کا گولا رکھ دیا گیا۔ اس رات طوفا اور حکیم کی بیوی

داری نے برساتی کے نیچے بڑے گرم ہو کر وقت گزارا۔ وہ دونوں حسب عادت چارپائی کھڑی کر کے اس کے پیچھے ایک ہی کمبل میں لپٹے بیٹھے تھے اور سوامن تھاپیوں کی آگ کا سینک ان تک برابر پہنچ رہا تھا۔ داری نے پوچھا۔

''اس آگ میں کون سی شے پک رہی ہے؟''

طوفے نے داری کے گال کی چٹکی بھر کر کہا۔

''عورتوں کی دوائی ہے جانی۔''

''عورتوں کی دوائی کیسی؟'' داری نے حیرانی سے پوچھا۔

''بس یہی تو راز ہے۔''

پھر طوفے نے داری کو سمجھایا کہ وہ دوائی کس کام آتی ہے تو داری نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''توبہ! یہ مرد بھی کتنے بے شرم ہوتے ہیں۔ انہیں سوائے ایسی باتوں کے اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔''

''میری جان! دنیا میں سوائے عورت ذات کے کے اور ہے کیا؟ ذرا بتاؤ اگر تم نہ ہوتیں تو تم کیا سمجھتی ہو کہ میں زندہ رہ سکتا تھا؟''

''تم جھوٹ بولتے ہو۔ پھر یقیناً تم کسی اور سے محبت کرتے۔''

''میں تم سے اور صرف تم سے محبت کرتا ہوں جانی!''

''تو پھر مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتے؟ پھر مجھے اس بڈھے حکیم کے پاس کیوں چھوڑ رکھا ہے؟''

''شادی؟'' طوفا گھبرا گیا۔ ''شادی بھی کرلوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔''

''قسم خدا کی تم آج حامی بھرو میں صبح ہی اس سے طلاق لے کر تمہارے پاس نہ آ جاؤں تو باپ کی بیٹی نہ کہنا۔''

''میں جانتا ہوں داری میں تمہاری بہادری کو پوری طرح سے جانتا ہوں لیکن ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ جب وقت آ گیا تو میں خود تمہیں کہہ دوں گا کہ داری فوراً طلاق لے لو۔''

داری نے آہ بھر کر کہا۔

''جانے وہ وقت کب آئے گا۔''

''بڑی جلد آ جائے گا۔ ذرا میری طرف منہ کرو۔''

''جاؤ میں تم سے نہیں بولتی۔ تم بے وفا ہو۔ تمہیں ذرا بھی خیال نہیں ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کہو داری! تم میرا دل توڑ رہی ہو۔''

دلجوئی اور پیار پچکار کی جھوٹی سچی باتوں سے داری کا جی خوش ہو گیا اور وہ اندھیرے میں طوفے کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ طوفے نے اسے گلے سے لگا لیا اور بار بار اس کا منہ چومنے لگا۔

''ہائے میرے تو ہونٹ بھی درد کرنے لگے ہیں۔''

داری نے ہونٹ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ طوفے نے اس کا ہاتھ چومنا شروع کر دیا۔ اچانک نیچے کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ داری جلدی سے الگ ہوئی۔ کمبل میں سے باہر نکلی اور مگ کے جنگلے پر کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے لگی۔ نیچے بتی روشن تھی اور اس کا خاوند حکیم ایک بچی کے منہ میں چوسنی دے رہا تھا۔ داری نے اوپر سے آواز دی۔

''ابھی آ رہی ہوں۔''

''تم اوپر کیا کر رہی ہو؟'' حکیم نے پوچھا۔

''آپ کی تھاپیوں کو دیکھ رہی ہوں کہ کہیں مکان کو آگ تو نہیں لگ گئی! میں تو آپ کے کشتوں سے تنگ آ گئی ہوں کیا تنور جل رہا ہے۔''

داری جلدی سے طوفے کے پاس آ کر اس کی بغل میں بیٹھ گئی۔ اچانک سیڑھیوں پر حکیم کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی۔ داری اچھل کر چارپائی کی اوٹ سے باہر نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ طوفا باہر نکل کر اپنی چھت پر کودے حکیم اوپر آ چکا تھا۔ طوفے کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے اور دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حکیم نے کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ وہ آگ کے الاؤ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور سلاخ سے جلی ہوئی سرخ تھاپیوں کو الٹنے پلٹنے لگا۔ داری کو موقع کی نزاکت کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ بھی حکیم کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''تھاپیاں پوری جل گئی ہیں۔''

''یہی تو میں اوپر دیکھنے آئی تھی۔''

''داری اگر تم اس طرح میرے کام میں دلچسپی لو تو خدا کی قسم دو ماہ میں تمہیں پورا حکیم بنا دوں۔ پھر محلے کی ایک بھی عورت ہسپتال نہ جائے۔''

''میں تو آپ کی شاگرد بننے کے لئے تیار ہوں۔ آپ ہی نہیں بناتے۔''

حکیم مسکرایا۔

''میری جان تم مجھ سے بات بھی نہیں کرتی ہو۔ ذرا بلاتا ہوں تو سو سو بہانے بنا کر بھاگ جاتی ہو۔ اب ہم کہاں جائیں۔ ہماری قسمت کہ تم سے دل لگا بیٹھے۔''

داری نے حکیم کے گلے میں بانہیں ڈال دیں بڈھے حکیم کی دنیا روشن ہوگئی۔ شاید پہلی بار وہ داری کے بازو اپنی گردن میں حمائل دیکھ رہا تھا۔ اس کا بڈھا خون جوش مارنے لگا۔ اس نے داری کا منہ چوم لیا داری نے مسکرا کر کہا۔

''نیچے چلتے ہیں۔ یہاں سردی ہے۔''

''چلو میری جان''

''آپ چلیں میں ذرا۔۔۔۔۔۔۔۔ اندر سے ہو کر ابھی آتی ہوں۔''

''جلدی آ جانا۔''

''آپ فکر نہ کریں۔''

حکیم جلدی جلدی نیچے اتر گیا۔ داری غسل خانے کے بہانے وہاں رہ رہ گئی۔ جب حکیم کی آواز سیڑھیوں میں گم ہوگئی تو داری لپک کر طوفے کے پاس آئی جس کا مارے خوف کے برا حال ہو رہا تھا۔

''میری جان تم نے بڑا ڈراما کر کے دکھایا ہے آج۔''

''تم سے محبت جو کرتی ہوں۔ اچھا کل ضرور آنا۔''

''کل تو میں منٹگمری جا رہا ہوں۔ پرسوں آؤں گا۔''

''پرسوں میں انتظار کروں گی۔''

''ضرور۔''

اتنا کہہ کر طوفا دیوار پھاند کر اپنی چھت پر چلا گیا اور داری جلدی سے نیچے چلی گئی طوفا اپنے گھر جا کر لحاف میں پڑ گیا لیکن اس کے ہاتھ پاؤں ابھی تک ٹھنڈے تھے۔ اس کا کمزور سا دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔ آج تقدیر نے بلکہ داری نے اسے بچا لیا تھا۔ وگرنہ وہ حکیم کو ساری زندگی منہ دکھانے کے لائق نہ رہتا۔ حکیم کو کس قدر صدمہ ہوتا کہ وہ شخص جسے وہ اپنا بچہ سمجھ رہا ہے اس کی بیوی کو گود میں لئے بیٹھا ہے۔ طوفے نے لحاف کے اندر ہی اندر ہاتھ جوڑ کر خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ سے وہ ایسی

حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ پھر اس کے دل کو تسلی ہوگئی اور اسے نیند آ گئی۔

ابھی دن نکلا ہی تھا کہ حکیم بستر میں سے نکل کر چھت پر آ گیا۔ الاؤ بجھ چکا تھا۔ تھاپیوں میں دبی ہوئی آگ کہیں کہیں دھک رہی تھی حکیم نے بڑی احتیاط کے ساتھ چمٹے کی مدد سے درمیان سے آگ ادھر ادھر ہٹا کر مٹی کا گولا باہر نکال لیا۔ مٹی جم کر پختہ ہوگئی تھی اور گولے کا رنگ سیاہی مائل سرخ ہوگیا تھا۔ حکیم گولا تھالی میں رکھ کر نیچے لے آیا۔ صحن میں فرش پر بیٹھ کر اس نے گولے کو ہتھوڑی کی ہلکی ہلکی ضربیں دے کر توڑ ڈالا' گولا ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہوگیا۔ حکیم کی خوشی سے چیخ نکل گئی۔

''بن گیا۔۔۔۔۔۔۔۔کشتہ بن گیا داری؟''

داری باورچی خانے سے اٹھ کر حکیم کے پاس بھاگی آئی۔ مٹی کے ٹکڑے کے عین بیچ میں تانبے کا پیسہ بتاشہ بنا پڑا تھا۔ کشتہ تیار ہو چکا تھا۔ حکیم کا نسخہ کامیاب رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور کامیابی کی مسکراہٹ تھی اور وہ عینک کے پیچھے آنکھیں گھما کر مٹی کے ٹکڑے میں پڑے ہوئے کشتے کو دیکھ رہا تھا۔ اس بتاشے کو بڑی احتیاط سے اس نے اٹھا کر ایک باریک سبز کاغذ پر رکھا اور نیچے دکان میں لے آیا۔ اس نے فوراً طوفے کو بلوایا۔

''طوفے میدان مارلیا۔''

جب طوفے نے سبز کاغذ میں لپٹا ہوا کشتے کا بتاشہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ اس نے تعجب سے بتاشے کو دیکھ کر پوچھا۔

''استاد جی یہ تانبے کے پیسے کی کیا گت بن گئی!''

''بیٹا یہ حکمت ہے۔ اسے کہتے ہیں طب۔۔۔۔۔۔۔اب لاؤ کسی بڑے سے بڑے ڈاکٹر کو اور کہو اسے ایک رتی تانبہ ہی مار کر دکھادے۔''

پری اور یاقوت نے بھی دوپہر کو کشتے کی زیارت کی۔ پری نے پوچھا۔ ''حکیم جی یہ کتنے کا ہوگا۔''

''میاں کسی راجواڑے میں لے جاؤ تو لاکھوں میں اٹھے۔ یہ تو غریب لوگوں کی امداد و خدمت کے لئے بنایا ہے۔ اس کا کوئی مول ہی نہیں ہے۔''

یاقوت نے مسکرا کر کہا۔

''حکیم یار لوگ پیسے کے لئے آدمی کو مار ڈالتے ہیں اور تم نے آدمیوں کے لئے پیسہ مار دیا ہے۔ میرا خیال ہے اس کشتے سے یقینا کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔''

''میاں دو روز بعد دتے کمہار کو دیکھنا اب۔ اگر تمہیں اس بڈھے پر جوان لڑکے کا شبہ نہ ہوا تو ہماری بے شک گردن کٹوا دینا۔''

طوفے نے پوچھا۔

''استاد جی! گھی کا بندوبست ہوگیا ہے؟''

''چھ سیر گھی دوپہر کے بعد یہاں آ جائے گا۔ تم جا کر دتے کمہار کو اطلاع کر دو۔ اسے کہو اپنی دوائی آ کر کھا جائے۔ یاقوت تم بھی یہیں رہنا۔ حکمت کی یہ کرامت ذرا تم بھی دیکھنا۔''

یاقوت نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

''میرا ان چیزوں پر اعتقاد نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے دتے کمہار کی زندگی کے ابھی کچھ سال باقی ہیں۔ لیکن مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ تم چھ سات دن کے اندر اندر اسے قبر میں پہنچا دو گے۔''

حکیم قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ طوفا بھی حکیم کے ساتھ ہنسنے لگا۔ پری نے کہا۔''حکیم جی! یاقوت کا خیال ٹھیک ہے۔ دتے کمہار کی ریڑی ہونے ہی والی ہے۔''

اتنا کہہ کر پری وہاں سے نو دو گیارہ ہوگیا۔ اتنے میں داری نے سیڑھیوں میں آواز دی کہ کھانا لے جایئے۔ حکیم نے طوفے کو اشارہ کیا۔ طوفا اٹھ کر سیڑھیوں میں گیا۔ داری چنگیر لئے کھڑی تھی۔

طوفے نے مسکرا کر پوچھا۔

''آج کیا پکایا ہے جانی؟''

داری نے ہنس کر کہا۔''گونگلو گوست۔''

''زندہ باد۔'' طوفے نے خوش ہو کر کہا۔''اور سنو! اگر تمہارا حکم ہو تو کشتے کی ایک ماشہ خوراک میں بھی کھا لوں؟''

''دفع دور!'' داری نے ہاتھ جھٹک کر کہا اور سلیپر کھڑکاتی اوپر چلی گئی۔

دتا کمہار محلے کی ایک پرانی حویلی میں اپنے دو چار گدھوں کے ساتھ رہتا تھا۔ امرتسر میں قلعہ بھنگیاں کے علاقے میں رہا کرتا تھا۔ فسادات میں جوان بیٹے کا سارا خاندان آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا۔ دنوں میں دیکھتے دیکھتے بوڑھا ہوگیا۔ ان دنوں باہر سے گدھوں پر مٹی لاد کر لاتا اور گلی گلی گھوم پھر کر بیچا کرتا۔ بوڑھی جان اور شخت مسقت۔ کمر میں مستقل درد رہنے لگا۔ حکیم سے دوائی لے کر

کھاتا رہا۔کوئی فرق نہ پڑا۔حکیم نے ایک روز پھر سے جوان بن جانے کی خوشخبری سنائی۔بڈھا کمہار باتوں میں آ گیا۔اس روز تیسرے پہر لاٹھی ٹیکتا حکیم کی دکان میں آیا۔وہاں یاقوت پری اور طوفا بھی موجود تھے۔بلکہ یہ لوگ دتے ہی کا انتظار کر رہے تھے۔

''آؤ بابا دتے اندر آ جاؤ۔''

''سلاماں لیکن حکیم جی!''

''وعلیکم سلام بابا۔۔۔۔۔۔۔۔بسم اللہ!''

حکیم کا مرغا آ گیا تھا جس پر وہ اپنے کشتے کا تجربہ کرنے والا تھا۔کیونکہ تانبے کا کشتہ تو بن گیا تھا لیکن اس میں قوت کتنی ہے؟اس کا تجربہ ابھی باقی تھا۔بابا دتا دری پر لاٹھی رکھ کر کمبل لپیٹ کر بیٹھ گیا۔سوکھا سا کھا چرخ سا بڈھا جس کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔اور گہرے سانولے چہرے پر جھریاں پھیلی تھیں۔سردی سے ٹھٹھرتا رہا تھا۔انگیٹھی میں دبی دبی آگ بھری تھی۔وہ سوکھے ہاتھ تاپنے لگا۔

''حکیم جی ایسی دوائی دو کہ کمر کا درد دفع ہو جائے اس نے کام کرنے جوگا نہیں چھوڑا۔کام نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے۔تمہارے بچے جئیں۔''

حکیم نے کشتے کا سبز کاغذ الماری میں سے نکالتے ہوئے کہا۔

''بابا دتا!تمہیں ایسی دوائی کھلا رہا ہوں کہ گھوڑے کی مانند دوڑتے پھرو گے۔سونا ہے سونا۔لاکھ روپے دے کر اس کی ایک رتی بھی کہیں سے نہ مل سکے گی تمہیں۔''

''تمہارے بچے جئیں!اب جان نہیں رہی بدن میں۔''

پری بڑے غور سے بابا دتے کو دیکھ رہا تھا۔بڑی گہری خاموشی کے ساتھ ایک طرف بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔طوفا ایک پیالی گرم پانی سے دھو رہا تھا گھی کا ڈبہ اس کے پاس ہی رکھا تھا۔حکیم نے سبز کاغذ کی تہیں کھول کر پسا ہوا کشتے کا سفوف باہر نکالا۔مکھن کی آدھی ٹکیا صندوقچی پر رکھی۔سوئی لے کر اس کا ناکہ سفوف میں بھرا اور اسے مکھن میں ملا دیا۔اور دتے کی طرف بڑھا کر بولا۔

''لو بابا دتے!اسے بسم اللہ کر کے کھا جاؤ اور جنت کے نظارے کرو۔''

''لاؤ حکیم جی!بسم اللہ۔''

''یا شافی!یا کافی!''

دیکھتے دیکھتے بابا دتا مکھن کی آدھی ٹکیا جس میں تانبے کا کشتہ ملا ہوا تھا نگل گیا۔ حکیم، طوفا، یاقوت اور پری اسے غور سے دیکھتے رہے۔

''طوفے! گھی نیم گرم کر کے پیالی میں ڈال دو۔''

بابا دتا مکھن کھا جانے کے بعد ہاتھوں سے منہ پونچھ رہا تھا۔ حکیم بڑی بے چینی کے ساتھ بڈھے کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک بڈھے کی حالت غیر ہونا شروع ہوگئی۔ وہ اپنی چھاتی مسلنے لگا۔

''حکیم جی پانی!''

''گھی دو طوفے۔''

حکیم چلایا اور گدی سے اچھل کر فوراً بڈے کمہار کے پہلو میں آن بیٹھا۔ طوفے نے جلدی سے پیالی میں گھی ڈال کر بڈھے کو دیا۔

''اسے ایک ہی گھونٹ میں پی جاؤ بابا!''

''پانی پانی! آگ لگی ہے۔ پانی!''

بڈھا پانی پانی چلا رہا تھا۔ اسے زبردستی گھی کی پیالی دی گئی۔ گھی کا اندر جانا تھا کہ بڈھے کی طبیعت متلانے لگی اور دیکھتے دیکھتے اسے قے ہوگئی۔ حکیم اور طوفے کا رنگ اڑ گیا۔

''طوفے! اور گھی دو اور گھی دو۔''

گھی کی اوپر تلے دو مزید پیالیاں بڈھے کو پلا دی گئیں۔ بڈھے نے اوپر تلے مزید قے کر دی۔ اس کا چہرہ کالا پڑ گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کے ہاتھوں پر رعشہ طاری ہو گیا اور آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں۔ یاقوت نے کہا۔

''اسے سنبھالو حکیم! یہ مر رہا ہے۔''

''خاموش۔۔۔۔۔۔۔!'' حکیم نے چیخ ماری'' طوفے دکان کا دروازہ بند کر دو۔ پری! کونے والی بوتل میں عرق گاؤزبان اٹھا لاؤ۔

بڈھے کی بگڑتی حالت دیکھ کر محفل میں بیٹھے سبھی پریشان ہو گئے۔ حکیم کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ بڈھے کمہار کو کبھی کوئی عرق اور کبھی کوئی دوائی پلائی جا رہی تھی۔ مگر اس کے ہاتھوں کا رعشہ ویسا ہی تھا اور رنگ سیاہ سے سیاہ تر ہو رہا تھا اور آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے دری پر لٹا دیا گیا اس کے تلوؤں پر کدو کے تیل کی مالش کی جانے لگی۔ حکیم نے سر میں بادام روغن کی آدھی شیشی انڈیل دی۔ آدھ

گھنٹے میں بڈھے کو آدھ سیر پکا گھی پلا دیا گیا۔ پاؤ بھر بادام روغن اس کے سر میں جذب ہو گیا اور دو چھٹانک کدو کا تیل اس کے تلوے چاٹ گئے۔ مگر اس کی آنکھیں بدستور اوپر چڑھی رہیں اور رعشہ طاری رہا۔ حکیم نے فوراً اپنا مفلر اتار کر بڈھے کا بازو کس کر سینے پر باندھ دیا۔ اب وہ رک رک کر سانس لینے لگا۔ یاقوت نے کہا۔

''کیا کر رہے ہو تم؟ اس طرح تو وہ مر جائے گا۔''

حکیم نے فوراً مفلر کھول دیا۔ حکیم دراصل گھبرا گیا تھا۔

پرسی نے کہا۔

''کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤں؟''

حکیم نے چیخ ماری۔

''بکواس بند کرو۔ اپنے ساتھ مجھے بھی قید کروانے کا ارادہ ہے کیا؟''

لیکن بڈھے کی حالت خراب سے خراب تر ہو رہی تھی۔ حکیم نے طرح طرح کی دوائیں اس کے منہ میں ڈالنی شروع کر دیں۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد بڈھے کی حالت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ حکیم نے اطمینان کا سانس لیا۔ باہر دن ڈھلنے لگا تھا۔ حکیم نے دکان کو باہر سے تالا لگوا دیا تھا اور اندر بتی جلا کر اپنے مریض پر جھکا ہوا تھا۔ حکیم کی جواں سال بیوی داری نے اوپر سے آواز دی تو طوفے نے سیڑھیوں میں جا کر کہا۔

''بابا دتے کو کشتہ دیا تھا۔ وہ ہضم نہیں ہوا۔''

داری نے ہاتھ مل کر کہا۔

''ہائے میں مر گئی۔ اب کیا ہو گا۔ یہ حکیم ہمیں تھانے پہنچا کر ہی دم لے گا۔''

طوفے نے داری کا کولہا تھپتھپا کر کہا۔

''فکر نہ کرو اس کی حالت ٹھیک ہو رہی ہے۔''

رات نو بجے کہیں جا کر بڈھا اس قابل ہوا کہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور نحیف آواز میں بولا۔

''یہ کیا کھلا دیا تھا حکیم جی! میرے اندر آگ لگ گئی ہے۔''

حکیم نے کھسیانا ہو کر کہا۔

''بابا یہ طاقت کی دوائی تھی۔ اب انشاءاللہ تمہیں کمر کا درد ساری زندگی نہیں ہوگا۔ مرض ختم ہو گیا ہے۔ اب تم گھر جا کر آرام کرو۔ صبح میں خود تمہیں آ کر دوائی پلا جاؤں گا۔''

بڈھے نے نقاہت سے کہا۔

''مگر حکیم جی! تیرے بچے جئیں مجھ سے تو اٹھا بھی نہیں جاتا۔''

''ہمت کرو بابا دتے! گھر جا کر آرام سے سو جاؤ۔ صبح بھلے چنگے ہو گے۔''

یاقوت اور پری اس دوران میں جا چکے تھے۔ حکیم نے طوفے کی مدد سے بڈھے کو اٹھایا اور باہر گلی میں لے آئے۔ سخت سردی میں گلی سنسان اور ویران تھی۔ ساری دکانیں بند تھیں۔ طوفا اسے سہارا دیتا حویلی کے اندر اس کے مکان میں لے آیا اور اسے چارپائی پر لٹا کر پانی کا گھڑا اس کے پاس رکھ کر جلدی سے باہر نکل آیا۔ رات بھر حکیم اور طوفے کو نیند نہ آئی۔ اسے معلوم تھا کہ صبح محلے بھر کو معلوم ہو جائے گا کہ بابا دتا مر گیا۔ اگر مرنے سے پہلے اس نے کسی کو بتایا کہ حکیم نے اسے طاقت کی دوائی کھلائی تھی تو وہ یقیناً پانچ چھ سال کے لئے جیل چلا جائے گا۔

صبح ہو گئی سورج نکل آیا۔ حکیم نے ڈرتے ڈرتے دکان کھولی طوفا دفتر جانے سے پہلے حکیم کے پاس آیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے ایک دوسرے کے پاس آیا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے ایک دوسرے کے دلوں میں چھپا ہوا خوف پڑھ لیا۔ حکیم نے آہستہ سے کہا۔

''حویلی کی طرف جا کر ذرا معلوم تو کرو۔''

طوفے نے زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا اور مفلر کانوں کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر حویلی کی جانب چل پڑا۔ اب بڈھا مر گیا ہوتا تو محلے والوں کو اس وقت تک ضرور پتہ چل گیا ہوتا۔ حویلی آ گئی۔ طوفا اندر جاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ وہ واپس آ گیا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔''

حکیم کو قدرے تسلی ہوئی۔ وہ دکان لگا کر بیٹھ گیا۔ طوفا دفتر چلا گیا۔ دوپہر کو اچانک محلے میں یہ خبر پھیل گئی کہ بابا دتا کمہار مر گیا ہے۔ خلیفہ حلوائی پیالہ صاف کرتے کہہ رہا تھا۔

''بے چارہ اندر پڑا پڑا سردی سے اکڑ کر مر گیا۔

دیکھتے نہیں۔ چہرہ سیاہ پڑ گیا ہے بے چارے کا۔''

حکیم کا رنگ زرد ہو گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سبز کاغذ میں رکھے ہوئے کشتے کے سفوف کو اوپر جا کر آگ میں ڈال دیا۔ طوفے نے دفتر سے آ کر یہ خبر سنی تو وہ کوٹھڑی میں جا کر لیٹ گیا اور شام تک باہر نہ نکلا۔ بڈھا رات ہی مر گیا۔ وہ کوئی بیان نہ دے سکا تھا۔ اسے حکیم کی دکان میں داخل ہوتے سوائے دو ایک آدمیوں کے کسی نے نہ دیکھا تھا۔ ان کو بھی شک نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ حکیم کی دکان پر وہ اکثر دوا لینے آیا کرتا تھا۔ حکیم بھی افسوس کرنے والوں کے ساتھ مل گیا۔

''خدا کی مرضی تھی بیچارے کی گھڑی آ گئی تھی۔ ابھی شام کو میرے پاس آیا اور شربت پی کر گیا تھا۔''

حکیم نے پرسی، یاقوت اور طوفے کے درمیان بیٹھ کر کہا کہ اب یہ راز باہر نہیں نکلنا چاہئے۔ اگر کسی کو اس کی خبر ہو گئی تو ہم چاروں مارے جائیں گے۔''

یاقوت نے کہا۔''لیکن تم بھی عہد کرو کہ آئندہ اپنا کشتہ سوائے اپنے اور کسی پر نہیں آزماؤ گے۔''

''وہ تو میں نے کل ہی قسم کھالی تھی۔''

پرسی بولا۔

''بڈھا ہضم نہیں کر سکا۔''

''حکیم نے فوراً کہا۔

''یہی تو مصیبت ہے کہ چیز اس قدر طاقتور تھی کہ اس کے لئے شیر کا معدہ چاہئے۔''

طوفے نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے آگ کم دی تھی ہم نے۔''

''نہیں جی! تانبہ تو بتاشہ بنا ہوا تھا اور یہی اس کے کشتہ ہونے کی علامت ہے۔ طب اکبر میں اس کا پورا باب ہے اور اس میں یہی لکھا ہے۔''

یاقوت نے سگریٹ بجھا دیا۔

''بہر حال اب تمہیں لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ اتنی بے دردی سے نہیں کھیلنا چاہئے۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم محض شربت اور عرق بیچا کرو۔''

حکیم چونکہ قصوروار تھا اس لئے چپکا ہو رہا۔ پری نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

"ہائے ہائے ہائے! بڈھے کا رنگ سیاہ ہو گیا ہے۔ بالکل توے کی طرح۔"

تیسرے پہر بابا دتے کو دفنا دیا گیا۔ جنازے میں حکیم' طوفا اور پری بھی شریک ہوئے اگلے روز محلے والے اس غیر اہم بڈھے کو بالکل بھول بھلا گئے اور محلے کی زندگی پھر سے پرانی نہج پر چلنے لگی۔ لیکن حکیم اور طوفے کو بڈھا خواب میں آ کر کئی روز تک ڈراتا رہا۔

جنوری کے آخری ہفتے میں لاہور کا موسم بڑا خوشگوار ہو گیا۔

شہر کے گہرے نیلے' شفاف آسمان پر سورج بڑے مزے سے اپنا دن بھر کا چکر پورا کرتا اور تاروں بھری چمکیلی رات اوس کے موتی لٹاتی آ جاتی۔ سردی میں وہ پہلے کی سی ہڈیوں میں چبھنے والی تیزی نہ رہی تھی۔ پھر بھی دن میں کورٹ کے بغیر باہر نہ نکلا جاتا اور رات کو خوب پالا پڑتا۔ یاقوت کی زندگی معمول کے مطابق اپنی بے ڈھنگی چال پر چل رہی تھی۔ دن کے دس گیارہ بجے وہ سو کر اٹھتا۔ نہا دھو کر کھانا کھاتا اور حکیم یا پری کے ہاں گپ بازی کو آ جاتا۔ شام کو شہر کی سڑکوں پر مٹر گشت کو نکل جاتا۔ رات کو کبھی فلم دیکھنے چل دیتا اور کبھی ہوٹل میں آ کر مطالعے میں غرق ہو جاتا اور رات بارہ ایک تک اسے سوائے کتاب کے اور کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔

ایک روز تیسرے پہر کوئی چار ساڑھے چار بجے کے قریب وہ حکیم کی دکان سے اٹھ کر باہر میکلوڈ روڈ پر آ گیا۔ پنواڑی کی دکان سے اس نے پان لے کر کھایا۔ سگریٹ کا پیکٹ لیا اور سوچنے لگا کہ ریگل والی پکچر دیکھی جائے۔ ابھی وقت بہت تھا۔ اس نے سوچا ہوٹل چل کر کپڑے تبدیل کرتے ہیں۔ کافی بنا کر پیتے ہیں اور پھر وہاں سے نکل کر حکیم یا پری کو ساتھ لیں گے اور فلم دیکھیں گے۔ یہ سوچ کر وہ اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس روز خلاف معمول سرد ہوا چل رہی تھی جس نے دھوپ کی خوشگوار حدت میں خاصی کمی کر دی تھی۔ اس اعتبار سے سردی بڑھ گئی تھی۔ بسنت کے تہوار میں کوئی دو ہفتے باقی تھے اور بقول پری کے۔

"لالہ! اب کے دیکھ لینا بسنت پالا پونت ہو گا۔"

معاملہ کچھ ایسا ہی دکھائی دے رہا تھا۔ ہوٹل کی لابی میں آ کر یاقوت جب اوپر اپنے کمرے میں جانے کے لئے سیڑھیاں چڑھنے لگا تو ایک بیرے نے آ کر اسے بتایا کہ ایک لڑکی نیچے کیبن میں اس کا انتظار کر رہی ہے۔ یاقوت نے ٹھٹھک کر پوچھا۔

"کون لڑکی؟"

بیرا مسکرایا۔

''جناب یہ مجھے معلوم نہیں۔کیبن نمبر پانچ میں چل کر دیکھ لیں۔''

یاقوت نے تجسس کے عالم میں کیبن کی طرف آ گیا۔کیبن کا پردہ گرا ہوا تھا۔اسے اندر لباس کی سرسراہٹ سنائی دی۔یاقوت پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔وہ ایک پل کے لئے وہی کھڑا رہا۔وہ بڑے تعجب کے ساتھ اپنے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی کلثوم کو دیکھ رہا تھا۔

''تم کلثوم؟''

''جی ہاں۔۔۔۔۔۔۔میں''

کلثوم کی آواز میں اداسی تھی۔اتنا کہہ کر اس نے آنکھیں جھکالیں۔یاقوت کافی دنوں کے بعد کلثوم کو دیکھ رہا تھا۔وہ پہلے سے کچھ کمزور اور زرد پڑ گئی تھی۔آنکھیں بھی کچھ کچھ سرخ ہو رہی تھیں۔جیسے رو کر آ رہی ہو۔یاقوت پریشان ہو گیا۔اس نے گھنٹی بجا کر بیرے کو کافی لانے کا کہا اور خاموشی سے کرسی بیٹھ گیا۔اس نے کلثوم پژمردہ چہرے کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''خیریت تو ہے کلثوم!تم اتنی اداس کیوں ہو؟تمہارے چہرے کی سرخی کو کیا ہوا؟تمہیں کس کی نظر لگ گئی جو اتنی کمزور ہو رہی ہو؟''

کلثوم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔وہ ریشمی رومال والا ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر رونے لگی۔یاقوت اور پریشان ہو گیا۔اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔کلثوم کا کس طرح دل بہلائے۔اسے کلثوم کے دکھ کا علم نہ تھا۔وہ پھر اسے کیونکر تسلی دے۔اتنے میں بیرا کافی لے کر آ گیا۔کلثوم آنکھیں صاف کر کے سنبھل کر بیٹھ گئی۔بیرا کافی رکھ کر چلا گیا۔کیبن میں خاموشی چھا گئی۔یاقوت نے کافی کی پیالی بنا کر کلثوم کے آگے کی۔

''کچھ کھاؤ گی؟''

''جی نہیں۔''

اس کی نقرئی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔چاندی کی اس گھنٹی کی طرح جو پانی میں ڈوب گئی ہو۔یاقوت نے ذرا سا موضوع بدلنے کی خاطر مسکرا کر کہا۔

''تمہیں میرے ہوٹل کا کیسے علم ہوا؟''

کلثوم پیالی میں چمچ ہلا رہی تھی۔اس نے کہا۔

''جس ٹیکسی میں اس روز آپ نے مجھے سوار کرایا تھا اس کا ڈرائیور آپ کو جانتا تھا۔''

''بہت خوب! ویسے میں خوش قسمت ہوں جو دوبارہ تم سے ملاقات ہوگئی۔ ورنہ میرا خیال تھا کہ اب اگلے جنم میں ہی ملیں گے۔''

کلثوم نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے کافی کے دو ایک گھونٹ پیے اور ایک گہرا سانس لے کر اداس نظروں سے کافی کی پیالی میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو تکنے لگی۔ یاقوت نے سگریٹ سلگا لیا۔ وہ بھی کلثوم کے ساتھ اداس ہو گیا تھا۔ لیکن وہ کلثوم کی اداسی کی وجہ دریافت کرنے کو بے تاب تھا۔ آخر اس نے پوچھا۔

''کیا تم مجھے اپنی پریشانی کی وجہ نہ بتاؤ گی کلثوم!''

''کیا تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں؟''

''اگر بھروسہ نہ ہوتا تو میں اس حالت میں آپ کے پاس کبھی نہ آتی۔''

''کونسی حالت میں؟''

کلثوم نے سر جھکا لیا۔

''کونسی حالت میں کلثوم؟ تم رک کیوں گئیں؟''

اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے تو پھر مجھ سے اپنا دکھ درد نہ چھپاؤ۔ جو بات ہے صاف صاف بیان کر دو مجھے اپنا ہمدرد اور غم خوار دوست سمجھو کلثوم۔''

کلثوم نے بھیگی ہوئی آنکھیں اٹھا کر کہا۔

''میں یہاں کچھ نہیں بتا سکتی۔ مجھے ڈر ہے کوئی سن نہ لے۔''

''تو آؤ اوپر کمرے میں چلتے ہیں۔''

یاقوت کلثوم کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے دروازہ اچھی طرح سے بند کیا۔ ہیٹر جلا کر کلثوم کے آگے کر دیا۔ خود سگریٹ سلگا کر صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا۔

''اب بتاؤ کلثوم تمہیں کس بات کی پریشانی ہے؟''

کلثوم ایک نہایت شریف ماں باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ ریلوے میں گارڈ تھا اور برانچ لائنوں پر گاڑی لے جایا کرتا تھا۔ چار بھائیوں کے بعد وہ ماں باپ کی اکیلی بیٹی تھی۔ گھر میں سبھی اس سے پیار کرتے تھے۔ اس کی ہر بات کا خیال رکھا جاتا تھا۔ بھائی اس

پر جان چھڑکتے تھے۔ دو بھائی ریلوے میں ملازم تھے۔ ایک بزنس کرتا تھا اور چھوٹا کالج میں پڑھ رہا تھا۔ تینوں بڑے بھائی شادی شدہ تھے اور صاحب اولاد بھی تھے۔ یہ سارا خاندان ایک ہی تین منزلہ کشادہ مکان میں رہتا تھا اور یہ مکان قلعہ گوجر سنگھ کے اندر جا کر ایک گلی میں تھا۔ کلثوم کے باپ نے اس مکان کو کلیم میں حاصل کر لیا تھا۔ بھاوجیں بھی کلثوم سے بڑا پیار کرتی تھیں۔ گھر میں ایک نند ہو تو بھاوجوں کی سہیلی بن جاتی ہے۔ ہمارے ہاں بھاوج نندوں کی لڑائی وہاں ہوتی ہے جہاں عام طور پر ایک سے زیادہ نندیں ہوتی ہیں۔ کلثوم نے دسویں جماعت ایک گرلز سکول سے پاس کی اور پھر لڑکیوں کے کالج میں داخل ہو گئی۔ کلثوم کو فلم دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ گھر والے کلثوم سے پیار کرتے تو بے حد تھے لیکن اس کے سینما بینی کے شوق کی انہوں نے کبھی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ کلثوم کو فلم دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ گھر والے کلثوم سے پیار کرتے تو بے حد تھے لیکن اس کے سینما بینی کے شوق کی انہوں نے کبھی حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ ایک تو اس لئے کہ کلثوم کے بھائیوں کو فلم کا بالکل شوق نہ تھا۔ دوسرے وہ لڑکیوں کا فلمیں دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔

کلثوم چوری چھپے اپنی سہیلیوں کے ساتھ اکثر کالج سے فرار ہو کر فلم دیکھ آیا کرتی۔ ایک دفعہ اس کی ایک پروفیسر کو اس بات کا علم ہو گیا۔ اس نے کلثوم کو سرزنش بھی کی اور اس کے باپ کو خط لکھ کر متنبہ بھی کر دیا۔ کلثوم کے باپ نے بیٹی کو بلا کر خط دکھایا اور اسے کہا کہ اگر آئندہ اسے اس قسم کی شکایت موصول ہوئی تو اسے کالج سے اٹھا لے گا۔ کلثوم کے باپ نے بیٹی کو بلا کر خط دکھایا اور اسے کہا کہ اگر آئندہ اسے اس قسم کی شکایت موصول ہوئی تو اسے کالج سے اٹھا لے گا۔ کلثوم نے وعدہ کیا کہ آئندہ انہیں ایسا موقع ہرگز نہیں ملے گا۔ لیکن کچھ عرصہ گزرنے پر فلم کے شوق نے پھر جوش مارا۔ سینما کے بورڈ اسے اپنی طرف بلانے لگے اور ایک روز وہ اپنی ایک ہم راز سہیلی فہمیدہ کے ساتھ ریجنٹ سینما کی طرف چل پڑی۔ فلم نئی نئی لگی تھی اور وہاں لوگوں کا بے پناہ رش تھا۔ دونوں سہیلیاں عورتوں کے کمرے میں دوسری خواتین کے ساتھ بند ہو کر بیٹھ گئیں۔ ان عورتوں کے مرد انہیں ٹکٹ لے کر دے رہے تھے۔ کلثوم اور فہمیدہ کا کوئی جاننے والا ساتھ نہ تھا۔ دونوں پریشان ہو گئیں۔ فلم کی دوسری گھنٹی بجنے لگی۔

ایک خوش پوش آدمی جس کے بال تیل میں چمک رہے تھے۔ بڑی دیر سے لابی میں سیڑھیوں کے پاس کھڑا ان دونوں لڑکیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس آدمی کا رنگ سانولا چہرہ پختہ بدن دوہرا اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ وہ اوپر گیلری کو جانے والی سیڑھیوں کے جنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا اور کلثوم کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے سگریٹ پی رہا تھا۔ اچانک اس نے سگریٹ ایک طرف پھینکا اور لوگوں کے ہجوم میں سے ہو کر کلثوم کے پاس آ کر بڑے اعتماد کے ساتھ جھک کر بولا۔

''میرے پاس اس وقت دو سیٹیں خالی ہیں۔ میری بہنوں کو آنا تھا وہ نہیں آئیں۔ آپ پیسے دیں۔ میں ٹکٹ بنوا تا ہوں۔''
کلثوم اس وقت فلم دیکھنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ اس نے ایک پل کے لئے بھی نہ سوچا کہ یہ آدمی کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ جھٹ سے پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ وہ آدمی ہجوم میں غائب ہو گیا۔ کوئی دو منٹ کے بعد وہ آیا اور بولا۔
''میرے ساتھ آیئے''
دونوں اس کے ساتھ ہولیں۔ وہ انہیں لے کر اوپر گیلری میں آ گیا۔ گیلری میں چاروں طرف لوگ ہی لوگ بیٹھے تھے۔ ایک شور مچا ہوا تھا۔ وہ آدمی انہیں ایک کونے کی طرف لے گیا جہاں تین سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ جب کلثوم اور فہمیدہ بیٹھ گئیں تو وہ بھی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔
''معاف کیجئے گا مجبوری ہے اور کوئی سیٹ خالی نہیں۔ آپ کو میرا بیٹھنا ناگوار تو نہیں گزرا؟''
ناگوار تو ان دونوں کو بہت گزرا تھا مگر اب وہ بھی پھنس گئی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کچھ نہ کہا اور نقاب گرا کر ایک دوسرے کے قریب ہو کر خاموش بیٹھی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرا چھا گیا اور پردے پر فلم شروع ہو گئی۔ اتفاق سے کلثوم اس آدمی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو برقعے میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ فلم چلتی رہی مگر کلثوم کا دل دھڑک رہا تھا۔ اسے ایک ناواقف مرد کے ساتھ فلم دیکھنا بڑا ناگوار لگ رہا تھا۔ لیکن مجبوری تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ اس آدمی نے بھی بڑی ہوشیاری کا ثبوت دیا۔ انٹرول ہو گیا لیکن اس نے ذرا سی بھی دست درازی نہ کی۔ انٹرول میں اس نے چائے اور پیسٹری وغیرہ منگوائی۔ کلثوم اور فہمیدہ نے پینے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس آدمی کے لجاجت آمیز لہجے اور بار بار کے اصرار پر وہ چائے میں شریک ہو گئیں۔ باتوں ہی باتوں میں اس آدمی نے بتایا کہ وہ فلموں کا کاروبار کرتا ہے اور ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی۔ کلثوم اور فہمیدہ نے اس کی کسی بات کا جواب نہ دیا۔ وہ باتیں کرتا رہا اور کبھی کبھی خود ہی بات کر کے ہنس پڑتا اور پھر کھسیانا سا ہو کر چپ ہو جاتا۔
''کل سے رتن سینما میں ہم نرگس کی ایک نئی فلم لگا رہے ہیں۔ اگر آپ آئیں تو مجھے خوشی ہو گی۔''
کلثوم نے جلدی سے کہا۔
''جی نہیں شکریہ!''
وہ جلدی سے بولا۔
''شکریہ ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کا سینما ہے جب جی چاہے جتنی سہیلیوں کو لے کر آ جائیں۔ کل ہفتہ ہے۔ میں کل

دوپہر کے شو پر آپ کا انتظار کروں گا اور اگر کل وقت نہ ملے تو بے شک پرسوں اتوار کو آ جائیں۔ اتوار کو ہمارا صبح دس بجے بھی ایک شو ہو گا۔''

وہ اپنے آپ باتیں کئے جا رہا تھا۔ یہ گول مٹول سا آدمی شکل وصورت سے بڑا احمق اور بدھو لگ رہا تھا۔ کلثوم نے سوچا کیسے بدھو سے پالا پڑ گیا ہے۔ چلو ہمارا کیا گیا۔ ذرا سے بور ہوئے ہیں فلم بھی دیکھ لی پھر اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

''یہ اپنے ٹکٹ کے پیسے لے لیں۔ میں نے کبھی ٹکٹ نہیں لیا۔ یہ تو ہماری اپنی فلم ہے۔''

''پھر آپ نے ہم سے پیسے کیوں لے لئے تھے؟'' کلثوم نے ناراضگی سے پوچھا۔

''ناراض نہ ہوں محترمہ ! غلطی ہو گئی معافی چاہتا ہوں۔''

اس آدمی نے چپکے سے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ اس کے کلچے ایسے ہاتھ جڑے ہوئے دیکھ کر کلثوم کو ہنسی آ گئی۔

''خدا کا شکر ہے کہ آپ ہنسی تو ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ کے منہ میں دانت ہی نہیں ہیں۔''

اب اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''میرا نام شہاب ہے۔ رتن، ریجنٹ اور کیپیٹل سینما میں جس کسی سے بھی آپ میرا نام لیں گی وہ آپ کو بڑی عزت سے ہال میں بٹھا دے گا اور ٹیکس بھی نہیں لے گا۔''

کلثوم اور فہمیدہ دل ہی دل میں ہنس دیں۔ بھلا انہیں کیا ضرورت تھی اس کا نام لے کر فلم دیکھنے کی؟ بڑا آیا حاتم طائی کہیں کا! اچانک بتیاں بجھ گئیں۔ ہال میں اندھیرا چھا گیا اور فلم شروع ہو گئی۔ کلثوم اب اس آدمی کو بدھو اور بے ضرر خیال کر کے پوری دلچسپی سے فلم دیکھنے میں محو ہو گئی۔ شہاب نے غیر ذمے داری کی کوئی حرکت نہ کی اور ان دونوں لڑکیوں پر اپنی ''شرافت'' اور الو پن کا پورا پورا سکہ بٹھا دیا۔ فلم ختم ہو گئی۔ دونوں سہیلیاں اس شخص سے کوئی بات کئے بغیر اٹھ کر باہر گئیں۔ جب وہ سینما کے ہجوم میں سے نکل کر تیز تیز قدم اٹھاتیں اپنے کالج کو جا رہی تھیں تو ایکا ایکی انہیں محسوس ہوا کہ وہی شخص ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ کالج تھوڑے فاصلے پر رہ گیا تو وہ شخص کلثوم کے برابر آ کر بولا۔

''میں رتن سینما کے باہر کل اور پرسوں بھی انتظار کروں گا۔''

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے واپس مڑ گیا۔

دونوں سہیلیاں اس شخص کی حماقت پر ہنس پڑیں۔

''کیسا الو آدمی تھا!''

''بالکل گدھا تھا''

دوسرے روز فہمیدہ نے خود ہی تجویز پیش کی۔

''کیا خیال ہے اس الو کو گدھا بنایا جائے؟''

کلثوم نے نیم رضامندی کے لہجے میں کہا۔

''مس نزہت کا پیریڈ ختم ہو لینے دو۔''

پیریڈ ذرا دیر سے ختم ہوگا۔کلثوم نے کہا۔

''دفع کرو فہمیدہ! کسی کو معلوم ہو گیا تو مصیبت آ جائے گی۔خواہ مخواہ میں لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

فہمیدہ کا خیال تھا کہ شہاب اس قسم کے آدمیوں میں سے ہے جو بدھو ہوتے ہیں۔جن کا عشق صرف لڑکیوں کو تحفے دینے' سینما دکھانے اور کھلانے پلانے تک ہی محدود ہوتا ہے اس سے آگے وہ ایک قدم نہیں اٹھا سکتے۔اگر ذرا انہیں ڈانٹ ڈپٹ کر رکھا جائے تو یہ بڑے فائدہ مند پالتو عاشق ثابت ہوتے ہیں۔اس نے اس بارے میں کلثوم کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔اس کے محلے کی دو ایک لڑکیوں نے اس قسم کے عاشقوں کو پھانس رکھا تھا اور وہ ان کو خوب بیوقوف بنا رہی تھیں۔چنانچہ دوسرے دن کلثوم کو ساتھ لے کر رتن سینما کی طرف چل پڑی۔جس وقت وہ رتن سینما کے باہر پہنچیں تو انہوں نے دیکھا کہ وہی شخص درمیان والے دروازے میں ایک طرف کھڑا سگریٹ پی رہا ہے۔شہاب کی چھوٹی چھوٹی مکار آنکھوں نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔اس نے سگریٹ پھینک دیا اور ہاتھ سے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔کلثوم نے کہا۔

''دیکھو اس الو کو اپنے اوپر اعتماد کتنا ہے۔اسے پورا یقین تھا کہ ہم اس کے پاس ہی آ رہی ہیں۔''

فہمیدہ نے کہا۔

''ہمیں فلم دیکھنی ہے اس گدھے سے کیا واسطہ!''

اس دفعہ شہاب نے ایک پورا بکس ریزرو کر وا رکھا تھا وہ دونوں سہیلیوں کو بکس میں لے کر بیٹھ گیا۔دونوں کے لئے بیس میں بیٹھنے کا تجربہ بڑا پر آسائش اور دلچسپ تھا۔وہ بکس میں اس سے پہلے کبھی نہ بیٹھی تھیں۔شہاب نے فوراً ان کے لئے چائے اور پیسٹری منگوائی اور پھر چائے بناتے ہوئے اپنی منحنی سی آواز میں بولا۔

''میں نے کل بھی آپ لوگوں کا ایک گھنٹہ انتظار کیا۔ میں تو ہر سینما میں ہر روز آپ کا انتظار کروں گا۔ دراصل آپ لوگوں سے کچھ ایسا انس ہوگیا ہے کہ جی چاہتا ہے روز آپ کے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھوں چائے پیوں۔ کار میں بیٹھ کر گلبرگ کی سیریں کروں انارکلی سے آپ کے لئے پیاری پیاری چیزیں خریدوں۔'' پھر آہ بھر کر بولا۔ ''لیکن ایسی قسمت کہاں؟''

کلثوم اور فہمیدہ ایک طرف منہ کر کے ہنس پڑیں۔ اب انہوں نے نقاب الٹ دیے تھے اور شہاب کلثوم کا حسن اور دلکشی دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ کلثوم فہمیدہ سے بڑھ کر خوبصورت اور پرکشش تھی۔ فہمیدہ کی صرف جوانی تھی جو شہاب کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور کلثوم کا جسم جوان ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خوبصورت بھی تھا۔ فلم شروع ہوگئی۔ شہاب چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے کسی قسم کی کوئی فضول حرکت نہ کی۔ انٹرول ہوا تو اس نے پھر چائے منگوالی اور ساتھ ہی تازہ کیک بھی منگوائے۔ فہمیدہ ذرا سی دیر کے لئے اٹھ کر غسل خانے گئی تو شہاب نے جھٹ سے جیب سے ایک ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر کلثوم کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

''یہ گولڈن رنگ ہے میں آپ کے لئے لایا تھا۔ یہ ایک معمولی سا تحفہ ہے۔ میں اکیلے میں یہ تحفہ دینا چاہتا تھا لیکن آپ کی یہ سہیلی تو سایہ بن کر ساتھ لگی ہے۔ اسے پرس میں رکھ لیں اور اپنی سہیلی سے اس کا بالکل ذکر نہ کریں۔''

کلثوم نے گولڈن رنگ کا تحفہ لینے سے انکار کر دیا۔ شہاب نے اگلے روز کی طرح اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''گستاخی کی معافی چاہتا ہوں مگر محبت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔''

کلثوم کچھ بولنے ہی والی تھی کہ باہر گیلری میں فہمیدہ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ شہاب نے جلدی سے کہا۔

''اب ضد نہ کریں اور اسے پرس میں چھپالیں۔ میں نہیں چاہتا آپ کی سہیلی اسے دیکھے۔ یہ لڑکی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔''

کلثوم ڈبیا پرس میں رکھ رہی تھی کہ فہمیدہ بکس کا دروازہ کھول کر اندر آگئی کلثوم کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ فہمیدہ کلثوم کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر وہاں خاموشی چھائی رہی۔ کلثوم نے آہستہ سے فہمیدہ سے پوچھا۔

''غسل خانہ کدھر کو ہے؟''

''گیلری کی نکڑ پر ہے''

شہاب نے کلثوم کا مکالمہ سن لیا تھا۔ جب کلثوم اٹھ کر باہر نکل گئی تو وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فہمیدہ کی ساتھ والی سیٹ پر آیا اور دوسری جیب سے سنہری رنگ کا لیڈیز فاؤنٹن پین نکال کر فہمیدہ کی طرف بڑھا کر بولا۔

''میں یہ معمولی سا تحفہ آپ کو پیش کرنا چاہتا ہوں میں تو کل بھی اس امید میں سینما کے باہر کھڑا رہا کہ آپ ضرور تشریف لائیں گی

لیکن افسوس کہ آپ نہ آئیں۔ آج آئیں تو آپ کی یہ منحوس سہیلی آپ کے ساتھ تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ دومنٹ کے لئے باہر دفع ہوئی ہے۔ مجھے اپنا حقیر خادم سمجھیں اور آپ کل سے مجھے ہمیشہ ریگل سینما میں مل لیا کریں میں۔۔۔۔۔۔۔۔"

فہمیدہ نے کہا۔

"یہ۔۔۔۔۔۔۔۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

شہاب نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لئے میرا دل نہ توڑیں نہیں تو میں یہاں سے چھلانگ لگا دوں گا۔ میں آپ سے اور صرف آپ سے محبت کرتا ہوں اور آئندہ اپنی اس منحوس سہیلی کو ساتھ نہ لائیں۔ اب جلدی سے اسے پرس میں رکھ لیں آپ کی سہیلی آ رہی ہوگی"

کلثوم کے قدموں کی آواز آئی اور پھر وہ بکس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی اس اثنا میں شہاب واپس اپنی سیٹ پر آ چکا تھا اور فہمیدہ نے گولڈن انڈی پن پرس میں رکھ لیا تھا۔ اس کا دل بھی زور سے دھڑکنے لگا۔ باقی فلم انہوں نے دھڑکتے دلوں پر ہاتھ رکھ کر دیکھی۔ مگر اپنی اپنی جگہ پر دونوں کو اس بات پر گمان تھا کہ دونوں میں سے صرف اسے ہی محبت اور تحفے کے لائق سمجھا گیا ہے۔ کلثوم نے سوچا کہ اس کے پاس بیٹھی ہوئی فہمیدہ اس کے جذبات سے کس قدر بے خبر ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ احمق شہاب نے اسے سونے کی انگوٹھی بطور تحفہ دی ہے اور فہمیدہ سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔ بالکل ایسی ہی بات فہمیدہ سوچ رہی تھی کہ کلثوم کتنی بھولی ہے۔ بیچاری کو کیا خبر کہ شہاب اس سے اظہار محبت کر چکا تھا اور اسے گولڈن انڈی پن بطور تحفہ بھی دیا ہے۔ بڑا مان تھا کلثوم کو اپنی شکل اور جسم پر۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ شہاب اس کے بارے میں کس قدر گھٹیا خیالات رکھتا ہے اور فہمیدہ پر جان چھڑکتا ہے تو کلثوم خودکشی کر لے!

فلم ختم ہوگئی۔ دونوں شہاب کے ساتھ باہر نکلیں۔ شہاب ایک دوست کی گاڑی مانگ کر لایا تھا۔ دونوں چپکے سے کار میں سوار ہو گئیں۔ کلثوم نے کئی بار خوبصورت کپڑوں والی عورتوں کو مردوں کے ساتھ سینما سے باہر نکل کر کاروں میں سوار ہوتے دیکھا تھا مرد بڑے تپاک سے دروازہ کھولتا اور بیگم صاحبہ بڑی شان بے نیازی سے لباس کے دائرے میں قوسیں سنبھالتیں اس میں سوار ہو جاتیں۔ آج کلثوم بھی کار میں سوار تھی اور ذرا سے ہارن کی آواز پر لوگ اپنے آپ ادھر ادھر ہٹتے جا رہے تھے۔ کلثوم نے انکھیوں سے فہمیدہ کو دیکھا اور سوچا کہ وہ صرف اس کی طفیل کار میں سوار ہے۔ وگرنہ شہاب تو اس کے ساتھ پیدل چلنا بھی گوارا نہ کرے کچھ اس قسم کی باتیں فہمیدہ بھی کلثوم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

کالج سے ایک چوک پیچھے ہی وہ کار میں سے اتر گئیں۔ گول مٹول احمق صورت شہاب نے بڑی چالاکی سے کلثوم کو اپنے فون

نمبروں والی چٹ ہاتھ میں تھمادی تھی۔ دونوں نے خاموشی سے کالج تک راستہ طے کیا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ کہیں دوسری اس کی خاموشی سے شک میں نہ پڑ جائے۔ انہوں نے جھٹ سے باتیں شروع کردیں اور شہاب کو بیوقوف بنانے کے بارے میں گفتگو کرنے لگیں۔

اگلے روز کلثوم نے سونے کی انگوٹھی پہن رکھی تھی اور فہمیدہ کی ریشمی قمیض سے گولڈن کلر کا خوبصورت انڈی پن لگا تھا۔ فہمیدہ نے کلثوم کی انگوٹھی دیکھ کر کہا۔

''ہائے کتنی پیاری انگوٹھی ہے کلثوم! کہاں سے بنوائی ہے؟''

کلثوم نے ناک میں سے ہلکی سی سول کر کے کہا۔

''بھائی جان نے لاکر دی ہے۔''

کلثوم کی نگاہ فہمیدہ کے سنہری انڈی پن کے چمکتے ہوئے کلپ پر پڑ گئی۔

''یہ انڈی پن نیا لیا ہے تم نے؟''

فہمیدہ نے بڑی شان کے ساتھ انڈی پن اتار کر کلثوم کو دکھایا۔ کلثوم نے اس کی ٹوپی اتار کر سنہری نب دیکھی اور پھر اپنی کاپی پر اپنا نام لکھا۔

''بڑا خوبصورت ہے۔ کتنے میں لیا ہے؟''

فہمیدہ نے ذرا سا کھنکار کر کہا۔

''ابا جان نے لا کر دیا ہے۔ کہتے تھے بیس روپے کا ہے۔''

کلثوم نے مسکرا کر کہا۔

''ہائے کتنے اچھے ہیں تمہارے ابا جان!''

اور پھر دونوں اپنے اپنے کلاس روم میں داخل ہو گئیں۔ دونوں اس بات پر خوش تھیں کہ ایک نے دوسری کو بیوقوف بنایا ہے اور اس بات کا افسوس بھی تھا کہ وہ اصل بات بتا کر دوسری کا جی نہیں جلا سکیں۔

فہمیدہ نے ریگل سینما میں شہاب سے روزانہ ملنا شروع کر دیا لیکن کلثوم ڈرتی رہی۔ اس کی زندگی میں ابھی تک کوئی آدمی داخل نہیں ہوا تھا۔ فلمیں دیکھ دیکھ کر اسے بھی ہیروئن بننے اور کسی کے انتظار میں کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر گیت گانے کا بے حد شوق تھا۔

وہ بھی چاہتی تھی کہ کوئی ہیرو اس کی یاد میں جنگلوں میں روتا پھرے اور وہ چپکے سے وہاں پہنچ جائے اور ہیرو خوشی سے چیخ مار کر اسے اپنے گلے سے لگا لے۔ مگر شہاب تو اسے ہیرو کے بجائے کوئی مسخرہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس سے کیا خاک پیار کرے۔ لیکن جوان لڑکی مرد کی شکل کے بارے میں اتنی دیر تک ہی سوچتی ہے جتنی دیر اسے کوئی مرد نہیں ملتا۔ جب ایک بار مرد اس کی زندگی میں آ جائے تو وہ اس کی شکل کو بھول کر اس کی ذات سے محبت کرنے لگتی ہے اور شہاب نے مکاری کے ساتھ اپنی شخصیت کا بڑا اچھا اثر کلثوم پر چھوڑا تھا۔ وہ ایک ناسمجھ، بھولا اور شریف انسان بن کر کلثوم کے سامنے آیا تھا۔ اس نے سینما میں ذرا سی بھی دست درازی نہیں کی تھی۔ اس نے ایک بار بھی بھونڈے پن سے کلثوم کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف نہیں کھینچا تھا۔ پھر بھی کلثوم اکیلی اس کے پاس جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔ زندگی میں پہلی بار ایک مرد نے پر جوش محبت کا اظہار کیا تھا۔ اور سونے کی قیمتی انگوٹھی کا تحفہ دیا تھا۔ دل میں تمناؤں کے ولولے اٹھ رہے تھے۔ امنگیں جوش مار رہی تھیں۔ مگر پاؤں میں خاندان کی عزت ماں باپ کے ناموس بھائیوں کی شرافت اور روایات کی وضع داری کی زنجیریں پڑی تھیں۔ دل آگے ہی آگے بڑھا جا رہا تھا مگر پاؤں پیچھے ہی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اسی لئے وہ اوندھے منہ گر پڑی۔ ایسی لڑکیاں ہمارے ہاں اکثر اوندھے منہ گرتی ہیں اور ایسا گرتی ہیں کہ پھر اٹھنے کے لئے بھی انہیں جگہ نہیں ملتی۔

شہاب کے جال کا ایک کنارا اب کلثوم کے کالج کی چار دیواری کو بھی چھونے لگا۔ وہ کتنی کتنی دیر کالج کے باہر آ کر کھڑا رہتا۔ فہمیدہ کا خیال تھا کہ وہ اس کے لئے آتا ہے۔ کلثوم سوچتی کہ وہ اس کی خاطر وہاں آتا ہے۔ شہاب نے فہمیدہ کو اپنے دام میں پوری طرح پھانس لیا تھا۔ وہ تو خواہ مخواہ میں ماری گئی تھی شہاب حقیقت میں کلثوم کو حاصل کرنے کی جستجو میں تھا۔ آخر ایک روز کلثوم نے ہار مان لی اور گاڑی میں سوار ہو کر شہاب کے ساتھ اکیلی ہی سینما دیکھنے چلی گئی۔ شہاب اسے لے کر سینما کے بکس میں آ کر بیٹھ گیا۔ اسے خوب کھلایا پلایا۔ جب فلم شروع ہوئی تو کلثوم کا ہاتھ پکڑ کر بڑے خوش اور ولولے کے ساتھ اپنی بے پایاں جھوٹی محبت کا اظہار کرنے لگا۔ کلثوم کا نازک دل سینے میں دھک دھک کرنے لگا۔ اس کا ہاتھ پہلی بار کسی غیر مرد نے اتنی محبت، اتنے جوش کے ساتھ دبایا تھا۔ اس کے ہونٹ کانپنے لگے۔ کنواری نوعمر لڑکی کا جسم اندھا ہوتا ہے۔ بہرا ہوتا ہے۔ وہ غیر مرد کے ذرا سے لمس پر ہی بید مجنوں کی طرح کانپنے لگتا ہے۔ پھر وہ ہزار آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ہزار کانوں سے سنتا ہے۔ اسے غیر مرد کے ہاتھ کے لمس کی چاہ ہوتی ہے۔ چاہے وہ ہاتھ اسے نالی میں گرا دے اور چاہے پکڑ کر حجلۂ عروسی کی طرف لے جائے۔ ٹہنی پر لگے گلاب کو کیا خبر کہ اسے دلہن کے جوڑے کے لئے توڑا جا رہا ہے یا کسی بدنصیب کے جنازے کی چادر کے لئے ۔۔۔۔۔۔ کلثوم کے ان چھوئے نوشگفتہ گلاب تک مرد کا ہاتھ پہنچ گیا تھا۔ ٹہنیاں کانپنے لگی تھیں۔ پتیاں لرز رہی تھیں۔ خوشبو پریشان ہو ہو کر اڑ رہی تھی۔ پنکھڑی پنکھڑی سمٹ رہی تھی۔ پھیل رہی تھی۔ ذرہ ذرہ

گہری نیند سے بیدار ہو رہا تھا۔کلثوم کی اپنی آنکھیں بند تھیں اور جسم کی ساری آنکھیں کھلی تھیں ۔اس کے خشک ہونٹوں پر ایک گہری چپ تھی اور اس کے جسم میں ایک ہنگامہ گرم تھا۔ ہاہا کار مچی تھی۔ایک کہرام بپا تھا۔

شہاب شکار کو مدہوش پا کر اسے جال سمیت اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔شکار جال میں جکڑا ہوا تھا۔شکاری شکار کے کانوں میں پریم کے منتر پڑھ رہا تھا۔جھوٹی محبت کا افسوں پھونک رہا تھا شکار نیم مدہوشی میں سرمار رہا تھا اور شکاری کے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔اور قریب۔۔۔۔۔۔۔۔اور قریب۔۔۔۔۔۔۔۔اور قریب!

ایک دم ہال میں روشنی ہوگئی۔شکار اور شکاری۔۔۔۔۔۔۔دونوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔شہاب نے جلدی سے سر نیچے کر لیا۔کلثوم دوسری طرف منہ کر کے اپنے کپڑے درست کرنے لگی۔وہ سر اوپر نہیں اٹھا رہا تھا۔وہ آنکھیں نہیں ملا رہی تھی ابھی ایک لحظہ پہلے دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے رہنے کی قسمیں کھا رہے تھے۔اور ایک منٹ بعد دونوں یوں آنکھیں چرا رہے تھے جیسے کبھی نہ ملنے کی قسمیں کھا رکھی ہوں اور اچانک آمنا سامنا ہوگیا ہو۔روشنی نے اندھیرے کو بے نقاب کر دیا تھا۔ایک لمحہ پہلے کی لذت اور مسرت پچھتاوے اور ملال میں تبدیل ہوگئی تھی۔وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر آہستہ آہستہ سسکیاں لینے لگی۔مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔تیر کمان سے نکل گیا تھا۔موتی اتھاہ گہرے سمندر میں گر چکا تھا۔پھول اپنی ٹہنی سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑا تھا۔اب دنیا کی کوئی طاقت اسے واپس ٹہنی پر نہیں لگا سکتی تھی۔شکاری اپنا کام کر چکا تھا۔شہاب نے کلثوم کو اپنے دام میں الجھا لیا تھا۔وہ کلثوم کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے جھوٹی تسلیاں دینے لگا۔اس چور کی طرح۔۔۔۔۔۔۔جو رات کو نقب لگائے اور صبح ٹوپی پہن کر افسوس کرنے والوں میں آ شامل ہو۔

شہاب کو خوب معلوم تھا کہ کلثوم اب اسے کبھی نہیں ملے گی۔اس سے نفرت کرنے لگے گی۔لیکن اگر وہ اس کے گناہ کا ذمہ داری اپنے سر لے لے۔اس سے شادی کا وعدہ کر لے تو وہ سوائے اس کے کسی دوسرے کے پاس کبھی نہیں جا سکے گی۔چنانچہ اس نے فوراً کلثوم کا ہاتھ تھام کر خدا کو حاضر ناظر جان کر شادی کا وعدہ کر لیا بے عصمت کنواری لڑکی کے لئے شادی سے بڑھ کر اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہوتی اور خاص طور پر جب وہی آدمی اس سے شادی کر لے جس نے اسے بے عصمت کیا ہو۔کلثوم کو یوں لگا کہ وہ تیز دھوپ میں ننگے سر کھڑی تھی کہ بادل کے ٹکڑے نے سورج کے آگے آ کر اس پر سائے کا آنچل ڈال دیا ہے۔اس نے سسکیاں لیتے ہوئے شہاب کا ہاتھ تھام لیا اور اس پر اپنے کپکپاتے ہوئے ہونٹ رکھ دیئے۔

اندھیرے میں عقل کا ساتھ چھوڑ کر کھائی کی ڈھلان پر ذرا سی پھسلی' ہوئی کلثوم اب نیچے ہی نیچے پھسلنے لگی۔وہ تقریباً ہر روز

شہاب سے ملتی۔صرف اس خیال سے کہ وہ اس کا ساتھ نہ چھوڑ دے۔اس کے سونے میں کھوٹ ملا کر کسوٹی پر ٹھونک بجا کر بار بار پرکھنے والی دنیا میں اکیلا نہ چھوڑ جائے۔شادی کے خوش آئند وعدے کی زنجیر میں جکڑی ہوئی داغ دار کلثوم شہاب کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔شہاب کو ایک بڑا پر لطف شغل ہاتھ آ گیا تھا۔وہ ڈالی سے ٹوٹے ہوئے پھول کو جی بھر کر مسل رہا تھا۔جب شہاب کے لئے اس پھول میں کوئی خوشبو نہ رہی تو اس نے اسے اٹھا کر باہر گلی میں پھینک دیا۔

اس وقت کلثوم کے پیٹ میں ایک ماہ کا بچہ تھا۔

یہ وقت کلثوم کے لئے بڑا نازک تھا۔وہ شہاب کے پیچھے پیچھے بھاگتی پھری اور وہ اسے ٹرخاتا رہا۔وہ کلثوم کے اسقاط حمل کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔کیا خبر کلثوم کی موت واقع ہو جائے! فہمیدہ کے ساتھ بھی اس نے یہی کیا تھا۔وہ الگ پریشان تھی اور کسی لیڈی ڈاکٹر کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی۔کلثوم کی دنیا اندھیری ہوتی جا رہی تھی۔شہاب اس سے ملنے کا وعدہ کرتا مگر نہ آتا۔جوں جوں وقت گزر رہا تھا کلثوم کی موت قریب آ رہی تھی۔آخر ایک روز اس نے شہاب کو پکڑ لیا اور رو رو کر اس سے مدد کی درخواست کی۔شہاب اس کی پتا سن کر رو دیا اور کلثوم کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبا کر بولا۔

''میری جان! مجھے معاف کر دو۔میری خطا بخش دو۔میں تمہارا گنا ہگار ہوں۔لیکن میں تم سے خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گا۔میں آج ملتان جا رہا ہوں۔کل ساڑھے دس بجے کی گاڑی سے واپس لاہور پہنچ جاؤں گا۔تم لاہور ہوٹل کے بالکل سامنے والے بس سٹاپ پر میرا انتظار کرنا۔میں گاڑی لے کر وہاں آؤں گا اور اکٹھے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلیں گے اور سارا کام ٹھیک ہو جائے گا۔''

کلثوم کا بوجھ ایک دم ہلکا ہو گیا۔اسے یقین ہو گیا کہ شہاب اس کے ساتھ مخلص ہے۔وہ محض کاروباری مصروفیات کی وجہ سے اسے نہیں مل سکا تھا۔آخر مرد کو محبت کے سوا اور کام بھی تو ہوتے ہیں۔اب کیا ضروری ہے کہ وہ صبح سے شام تک ایک لڑکی کے ساتھ ساتھ ہی گھومتا پھرے۔کلثوم شہاب کے بارے میں اس قسم کی باتیں سوچنے لگی۔شہاب نے کلثوم کے گلے میں بازو ڈال کر اسے اپنی گود میں کھینچ لیا۔

دوسرے روز ٹھیک وقت پر کلثوم گھر سے نکلی اور لاہور ہوٹل کے سامنے والے بس سٹاپ پر آ کر شہاب کا انتظار کرنے لگی جو ملتان سے صرف کلثوم کی خاطر لاہور آ رہا تھا۔اور جو اس وقت سمن آباد اپنے گھر میں ناشتہ کرنے کے بعد بڑے مزے سے آرام کرسی پر لیٹا اخبار پڑھ رہا تھا۔جسے یاد ہی نہ تھا کہ اس کی زخم خوردہ ایک پریشان حال لڑکی اس وقت لاہور ہوٹل کے باہر اس کا شدت سے انتظار

کررہی ہے۔اور ہر کار کے گزر جانے پر سوچتی ہے کہ اگلی گاڑی شہاب کی ہوگی۔کافی دیر انتظار کے بعد جب شہاب نہ آیا تو کلثوم پریشان ہوکر واپس گھر کی طرف چل دی۔وہاں سے پھر پلٹ کر چوک کی طرف آئی۔یہ وہ وقت تھا جب یاقوت پنواڑی کی دکان کے آگے کھڑا سگریٹ خرید رہا تھا۔اور اس نے گھبرائی ہوئی لڑکی کو دیکھا تھا جو چوک عبور کررہی تھی۔کلثوم چوک عبور کر کے ذرا دور تک چلی اور پھر سڑک پار کر کے واپس دوسرے چوک میں آ کر کھڑی ہوگئی۔وہ بے حد پریشان تھی۔کبھی اس طرف دیکھتی۔کبھی دوسری طرف تکتی۔شہاب کہیں نظر نہ آرہا تھا۔

''اس وقت مجھے تم دکھائی دیئے۔تمہاری آنکھوں میں جانے کیوں مجھے مہر ومحبت کی روشنی سی نظر آئی اور میرا دل چاہا کہ فوراً تمہارے پاس آ کر ہاتھ پکڑلوں اور تم پر اپنا سارا دکھ ظاہر کردوں۔لیکن میں ایسا نہ کرسکی اور سٹیشن کی طرف چل دی کہ شاید گاڑی لیٹ ہوگئی ہو۔وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ملتان کی گاڑی کو پہنچے ایک گھنٹہ ہوچکا ہے۔اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے تم بھی جانتے ہو۔''

کلثوم نے سر جھکا لیا۔اس کی دردناک کہانی سن کر یاقوت پر بڑا گہرا اثر ہوا۔اس لئے نہیں کہ کلثوم کے ساتھ گزرے ہوئے واقعات عبرت انگیز اور ہولناک تھے بلکہ اس لئے کہ ان واقعات کی وجہ سے کلثوم پریشان تھی۔اداس تھی اور مصیبت میں مبتلا تھی۔یاقوت سگرٹوں کا پورا پیکٹ پھونک چکا تھا۔اس نے بڑی شفقت اور پیار سے کلثوم کا نازک اور خوبصورت ہاتھ تھام لیا۔جس کے بارے میں اس کا اعتقاد تھا کہ وہ صرف پھول توڑنے کے لئے بنائے گئے ہیں اور جو اس وقت بید مجنوں کی شاخ کی طرح سرد تھے اور کانپ رہے تھے۔

''لیکن کلثوم تم دوبارا مجھے کیوں نہ ملیں۔کیا تمہیں یقین تھا کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔''

کلثوم نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

''مجھے ہر مرد سے ڈر آنے لگا تھا۔فہمیدہ اور میں نے مل کر ایک لیڈی ڈاکٹر کو آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہیں۔کراچی میں اس کی ایک لیڈی ہیلتھ وزیٹر سہیلی تھی۔وہ تو وہاں چلی گئی۔میں کراچی نہیں جاسکتی۔میں تمہارے پاس آ گئی۔''

یاقوت اٹھ کھڑا ہوا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔پھر وہ کھڑکی کے پاس رک گیا۔پردے پر انگلیاں پھیرتا رہا۔پھر کلثوم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کا شانہ دبا کر بولا۔

''میں تمہیں اب بھی باعصمت اور پاک باز سمجھتا ہوں۔میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔مجھ سے جو ہوسکا وہ کروں گا اور جو نہ ہوسکا اس کی پوری پوری کوشش کروں گا۔اب تم گھر جاؤ۔کل چار بجے میں تمہارا ہوٹل میں انتظار کروں گا۔مجھے پوری امید ہے کل تم اس بوجھ

سے سبکدوش ہو جاؤں گی۔"

کلثوم کو اس وقت یاقوت ایک فرشتہ معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اسے دریا کی تیز لہروں میں ڈوبتی کو بچا لیا تھا۔ اس نے فرطِ عقیدت سے اپنا سر یاقوت کے سینے سے لگا دیا اور آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے یاقوت نے قبر پر سے پھول اٹھا کر اپنے کوٹ میں لگا لیا ہو۔ کلثوم کے بالوں میں سے کسی خوشبودار تیل کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ یاقوت نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ خوشبو حنا کی مہک میں بدل گئی اور اسے یوں لگا جیسے نجمہ اس کے سینے سے لگی ہو۔ وہ کلثوم کے شانوں پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ نجمہ کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ کلثوم کو بڑی پر گرم، پر آسائش اور لطیف ترین لذت کا احساس ہوا۔ یاقوت نے آنکھیں کھول دیں اور گہرا سانس بھر کر کہنے لگا۔

"آؤ چلیں کلثوم! تمہیں دیر ہو رہی ہو گی۔"

یاقوت کا ایک دوست میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔

صبح ناشتے کے بعد یاقوت اس کے کالج جا پہنچا تھا۔ اس کا دوست جس کا نام عزیز تھا اسے کالج کے لان میں مل گیا۔ عزیز بڑی گرمجوشی سے ملا اور یاقوت کو ٹک شاپ کی طرف لے گیا۔

"چلو چائے پیتے ہیں۔ تم بڑے دنوں بعد آئے ہو۔ کہاں رہے اتنے دن؟"

"ٹھیک سے یاد نہیں کہاں کہاں رہا۔ بہرحال لاہور میں ہی تھا۔"

دونوں ٹک شاپ کے باہر باغ میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ دھوپ خوب چمک رہی تھی اور کیاریوں میں پھول کھل رہے تھے۔ ہری ہری گھاس پر دو ایک بسنتی رنگ کے ٹڈے پھدک رہے تھے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ اتنے میں چائے آ گئی اور دونوں چائے کی پیالی اٹھا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ یاقوت نے چائے کی پیالی خالی کر کے سگریٹ سلگا لیا اور بولا۔

"میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں تمہارے پاس آیا ہوں۔"

"کہو کہو۔۔۔۔۔۔۔ کیا کام آ پڑا؟" عزیز نے بڑی توجہ سے جواب دیا۔

یاقوت نے عزیز کو مختصر لفظوں میں ساری بات سنا دی۔ عزیز سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا ایسا ممکن نہیں؟" یاقوت نے عزیز کو فکر مند دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے تو یہ بائیں ہاتھ کا کام ہے۔''

''پھر تم سوچ میں کیوں پڑ گئے؟''

عزیز نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

''مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔''

''کیا گناہ ہے؟ یعنی ناجائز بچہ پیدا کرنا یا ناجائز بچہ گرا دینا؟''

''دونوں ہی۔''

''ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ لیکن اس وقت میں تمہارے پاس محض اس لئے آیا ہوں کہ کسی ایسی عورت کا بندوبست کرو جو یہ کام کر دے۔ تم خود نہ کرو۔''

عزیز خاموش رہا۔ وہ دوسری پیالی بنا رہا تھا۔ پھر یاقوت کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

''تم اس لڑکی کی مدد کس لئے کرنا چاہتے ہو؟''

یاقوت نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگا کر کھلے نیلے آسمان کی طرف دھواں اڑاتے ہوئے پوچھا۔

''تم کیا سمجھتے ہو؟''

عزیز ہنس دیا۔

''میرا خیال ہے تم اس سے محبت کرنے لگے ہو۔''

یاقوت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے چائے کی دوسری پیالی کے ہلکے ہلکے گھونٹ پیتا رہا اور گھاس کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ عزیز نے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''شاید مجھے یہ سوال نہیں کرنا چاہئے تھا۔ بہر حال تم لڑکی کو ساتھ لے کر پانچ بجے میرے پاس آ جانا۔ میں تمہیں ایک جگہ لے چلوں گا سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کسی نقصان کا ڈر تو نہیں؟''

عزیز نے بھنویں اٹھا کر کہا۔

''ڈیڑھ ماہ اوپر ہو گیا ہے۔ نقصان کا ڈر تو بہر حال ہے لیکن کوشش کریں گے کہ اسے کچھ نہ ہو۔ اس کی صحت پر زیادہ برا اثر نہ

پڑے ہم نے تو یہ پڑھا ہے کہ عورت کا ایک بار حمل گرانا دس بار بچہ پیدا کرنے کے برابر ہوتا ہے۔یعنی ایک بار اسقاط حمل کے بعد وہ دس بچوں کی ماں معلوم ہونے لگتی ہے۔''

''یہ بات تو بڑی تشویشناک ہے۔''

''ہے تو سہی لیکن اب مجبوری ہے۔اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں۔جیسا کہ تم کہہ رہے ہو اس کی شادی بھی نہیں ہو سکتی۔پھر یہ خطرہ تو مول لینا پڑے گا۔''

آدھ گھنٹے بعد یاقوت اپنے دوست سے پانچ بجے کا وعدہ لے کر واپس ہوٹل آ گیا۔یہاں آ کر اس نے کھانا کھایا اور پلنگ پر لیٹ کر ہارڈی کا ناول پڑھنے لگا۔تھوڑی دیر بعد اسے نیند آ گئی۔اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ یاقوت نے پلنگ پر سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔باہر کلثوم کھڑی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے اور چہرہ بھی پچھلے روز کی نسبت زیادہ شگفتہ اور صحت مند دکھائی دے رہا تھا۔

''آپ سو رہے تھے کیا؟ میں نے آپ کو پریشان کر دیا!''

''نہیں نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔اندر آ جاؤ۔کیا وقت ہوا ہے؟''

''ساڑھے چار بج رہے ہیں۔میں کوئی آدھ گھنٹہ نیچے کیبن میں بیٹھی رہی۔پھر یونہی میں نے بیرے سے آپ کا پوچھا تو اس نے کہا کہ آپ تو کمرے میں ہیں۔''

''ہاں میں کھانا کھانے کے بعد ذرا لیٹ گیا تھا کہ نیند آ گئی۔بیٹھ جاؤ۔چائے منگواؤں۔''

''کوئی خاص ضرورت نہیں۔''

''ایک ایک پیالی پی لیتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر یاقوت نے نیچے چائے کی گھنٹی دی اور تولیہ لے غسل خانے میں منہ ہاتھ دھونے چلا گیا۔کلثوم کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ پہلے روز وہ اتنی پریشان تھی کہ اسے کمرے میں سوائے یاقوت کے اور کچھ نظر نہ آیا تھا۔کمرہ چھوٹا سا تھا۔اس میں ایک پلنگ اور میز کرسیاں رکھی تھیں۔الماری اور شیلف کتابوں سے لدے ہوئے تھے۔میزوں پر بھی رسالے اور کتابیں ہی کتابیں پڑی تھیں۔میز کے نیچے اخبارات' رسالہ جات اور میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔سرہانے کی طرف دیوار پر ساتھ شیشے کے فریم میں دو چھوٹی سی تصویریں لٹک رہی تھیں۔دونوں تصویریں قلم اور سیاہی سے بنائی گئی معلوم ہوتی تھیں۔ایک تصویر ایک ساڑھی والی عورت ماتھے پر تلک لگائے

اکتارا ہاتھ میں لئے آنکھیں بند کئے کھڑی تھی اور دوسری میں ایک سرمنڈا کمزور سا آدمی صرف ایک دھوتی پہنے کھڑتالیں ہاتھوں میں لئے جھک کر کھڑا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ گاتے ہوئے ناچ بھی رہا تھا۔ ان دو تصویروں کے علاوہ کمرے میں کوئی کیلنڈر اور تصویر نہ تھی۔ یاقوت تولئے سے منہ پونچھتا باہر آ گیا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹائی کی گرہ درست کرنے لگا۔ کلثوم نے پوچھا۔

''یہ تصویریں کن کی ہیں؟''

''میری ہیں۔''

کلثوم ہنس پڑی۔ یاقوت نے آئینے میں اسے مسکراتا دیکھا۔ اس کے سفید موتیوں ایسے دانت اسے کتنے دنوں بعد نظر آئے تھے۔ اس کی ہنسی کی چاندی ایسی آواز اس نے ایک مدت کے بعد سنی تھی۔

''میرا مطلب ہے کہ ان تصویروں میں کون لوگ بنے ہیں۔''

یاقوت نے مسکرا کر تصویروں کی طرف دیکھا اور بولا۔

''ان میں ایک بھگت کبیر ہے اور ایک میرا بائی ہے۔''

کلثوم حیرانی کے ساتھ تصویروں کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ کون ہے؟''

''تمہیں نہیں معلوم؟''

''نہیں تو۔۔۔۔۔۔۔ میں نے تو یہ نام زندگی میں پہلی بار سنے ہیں۔''

''جب ہی تم اس قدر پریشان ہوئی ہو۔ اگر کسی نے شروع ہی سے تمہیں ان لوگوں کے بارے میں تھوڑا تھوڑا بتایا ہوتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ بہرحال سنو! یہ بھگت کبیر ہے۔ یہ بنارس میں دوہے گایا کرتا تھا اور یہ میرا بائی ہے یہ جے پور کے جنگلوں میں بھجن لکھ کر اکتارے پر گایا کرتی تھی۔ اس سے زیادہ میں تمہیں فی الحال کچھ نہیں بتا سکتا۔''

کلثوم نے حیرت سے کہا۔

''یہ ہندو تھے؟''

''نہیں۔۔۔۔۔۔۔ شاعر تھے اور انسانوں سے محبت کرتے تھے۔''

کلثوم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔ پھر اسے اپنی پتا کا خیال آ گیا۔ اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میرا مطلب تھا کوئی خطرے کی بات تو نہیں؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔''

اتنے میں چائے آ گئی۔ چائے پینے کے بعد یاقوت نے گھڑی دیکھی پانچ بجنے میں چار منٹ باقی تھے۔

''میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔''

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور سیڑھیاں اتر کر ہوٹل سے باہر آ گئے۔ باہر آ کر انہوں نے ٹیکسی لی اور سیدھے میڈیکل کالج پہنچ گئے۔ عزیز لان کے بیچ پر دھوپ میں بیٹھا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ یاقوت نے سرسری طور پر کلثوم کا عزیز سے تعارف کروایا۔ کلثوم نقاب گرائے شرم سے سر جھکائے کھڑی رہی۔ اسے بے حد شرم آ رہی تھی۔ اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ نا سمجھی اور جذبات کی رو میں بہہ کر وہ کس قدر خوفناک غلطی کر بیٹھی تھی۔ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

عزیز انہیں شہر سے باہر لے گیا۔ وہاں درختوں میں گھری ہوئی پرانی طرز کی ایک بوسیدہ سی کوٹھی تھی۔ ٹیکسی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر کھڑی ہو گئی۔ عزیز نے انہیں ایک ٹھنڈے نیم روشن نمکدار کمرے میں لے جا کر بیٹھا دیا۔ ٹھنڈ سے کلثوم کے بدن میں کپکپی دوڑ گئی۔ کمرے کی چھت اونچی اور کڑیاں بڑی تھیں۔ کونے میں ایک لمبی پرانی میز پر گرد جم رہی تھی کرسیوں کا بید ادھڑ رہا تھا۔ دیوار پر ایک پھٹا ہوا کیلنڈر لگا تھا جس میں ایک عورت بچے کو گود میں لئے دودھ پلا رہی تھی نیچے لکھا تھا ''صحت۔ بچہ۔ ماں'' ایک لمبا سا دروازہ دوسرے کمرے میں کھلتا تھا جو بند تھا۔ ڈاکٹر عزیز وہ دروازہ کھول کر دوسری طرف چلا گیا۔ کتنی ہی دیر وہ اندر رہا۔ کلثوم کو خوف سا محسوس ہونے لگا۔ کمرے کی فضا میں ٹنکچر وغیرہ کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یاقوت سگریٹ سلگائے کمرے میں کچھ دیر ٹہلتا رہا۔ پھر کلثوم کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور ہاتھ رگڑ کر بولا۔

''یہ کمرہ تو برف ہو رہا ہے۔''

''یہاں کون رہتا ہے؟''

''ایک لیڈی ڈاکٹر ہے۔ عزیز کی واقف ہے۔''

کلثوم نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

''اچھی لیڈی ڈاکٹر ہے؟''

یاقوت مسکرایا۔

''میں بھی اسے تمہارے ساتھ ہی پہلی بار دیکھوں گا۔لیکن پوری تعلیم یافتہ ہے۔''

کلثوم نے خشک لبوں پر زبان پھیر کر کہا۔

''مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔''

یاقوت نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''گھبرانے کی ضرورت نہیں۔میں تمہارے ساتھ ہوں۔اور پھر عزیز نے بتایا ہے کہ ڈاکٹرنی بڑی تجربہ کار ہے۔ اس نے ایسے سینکڑوں کیس کئے ہیں۔

کلثوم خاموش ہوگئی۔اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی سامنے والا دروازہ کھلے گا۔اندر سے ایک عورت چھرا لے کر نکلے گی اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی۔وہ شہاب کو بددعائیں دینے لگی۔اپنے آپ کو کوسنے لگی کہ اس نے ایسی حرکت ہی کیوں کی کہ آج کا دن دیکھنا پڑا۔اچانک دروازہ کھلا اور عزیز کے ساتھ ادھیڑ عمر کی کالے رنگ کی ایک خوفناک سی عورت باہر نکلی۔سر کے خشک بال پھولے ہوئے تھے گلے میں سیٹتھوسکوپ لٹک رہی تھی۔وہ سیدھی کلثوم کے پاس آ کر رک گئی۔ کلثوم سہم کر اٹھی ہوگئی۔ڈاکٹرنی کی آنکھیں سرخ تھیں اور ماتھے کی بائیں جانب زخم کا لمبا نشان تھا۔وہ عورت اسے قصائن معلوم ہوئی۔مگر کلثوم سوائے صبر کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ڈاکٹرنی نے کلثوم کی نبض دیکھی اور ناک سے پھنکار سی مار کر بولی۔

''اسے اندر لے آؤ۔''

عزیز نے یاقوت کو وہیں بیٹھنے کو کہا اور خود کلثوم کو لے کر اندر چلا گیا۔اندر ایک لمبی سی میز پڑی تھی جس کے نیچے زرد رنگ کی میلی سی بالٹی رکھی تھی۔الماری میں قسم قسم کے خوفناک شکلوں والے اوزار رکھے تھے۔دیوار کے ساتھ ربڑ کی ناک لٹک رہی تھی۔

''یہاں لیٹ جائیں بی بی۔''

ڈاکٹرنی نے اپنے مخصوص بے حس ٹھنڈے اور کرخت لہجے میں کلثوم کو حکم دیا اور خود عزیز کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ عزیز نے یاقوت سے سو روپے کا ایک نوٹ لے کر ڈاکٹرنی کے حوالے کیا۔ڈاکٹرنی نے اسے لمبے ڈھیلے ڈھالے سفید کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔عزیز اور یاقوت باہر لان کی ہلکی ہلکی دھوپ میں سگریٹ سلگا کر بیٹھ گئے اور ڈاکٹرنی ایک نرس کو ساتھ لے کر کلثوم کے پاس آ گئی۔

کلثوم سہمی سہمی' ڈری ڈری چھوٹے سے یخ بستہ کمرے میں ایک ٹھنڈے سٹول پر بیٹھی ٹھٹھر رہی تھی۔ڈاکٹرنی نرس کے ہمراہ

کمرے میں داخل ہوئی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

''چلو بی بی برقعہ اتارو اور میز پر لیٹ جاؤ''

نرس نے جلدی سے سپرٹ لیمپ جلایا۔ ایک ڈبہ کھول کر مختلف اوزار الٹ پلٹ کرنے لگی۔ ڈاکٹرنی نے مختلف قسم کے بینگے ٹیڑھے اوزار الماری میں سے نکال کر میز پر سجا دیئے۔ ربڑ شیٹ میز پر کھسکا کر آگے گیا۔ ایک ربڑ شیٹ اپنی کمر کے گرد اور منہ پر سفید کپڑا باندھ لیا۔ کلثوم کے ہاتھ پیر ایک دم ٹھنڈے ہو گئے چہرہ زرد پڑ گیا۔ دل حلق کے قریب آ کر دھڑکنے لگا۔ ڈاکٹرنی اس کی طرف لال لال آنکھیں گھما کر بولی۔

''کیا کر رہی ہو بی بی؟ میز پر لیٹ جاؤ۔''

کلثوم ایک بت کی طرح میز پر لیٹ گئی۔ نرس نے دیکھتے دیکھتے کلثوم کے بازو میں دو ٹیکے لگا دیئے۔ دہشت کے مارے کلثوم کو درد کا کچھ بھی احساس نہ ہوا۔ لیکن جب ڈاکٹرنی نے اپنا تکلیف دہ عمل شروع کیا تو کلثوم کے منہ سے خوفناک چیخ نکل گئی۔ ڈاکٹرنی نے غصے سے تڑپ کر کہا۔

''میں نے چھری تو نہیں ماردی۔ اگر اپنا اتنا خیال تھا تو اس حرام زادے کے پاس کیوں گئی تھی؟''

کلثوم نے اپنے دانتوں تلے دوپٹہ داب لیا۔ درد کی شدید لہریں اٹھ رہی تھیں مگر کلثوم نے اس کے بعد زبان نہ کھولی۔ اس کے ماتھے سے پسینہ بہنے لگا۔ حلق خشک ہو گیا۔ ہونٹ لکڑی بن گئے۔ زبان اکڑ گئی مگر وہ آنکھیں بند کئے درد سہتی رہی۔

آدھ گھنٹے بعد جب نرس کا سہارا لئے برقع اوڑھے کلثوم باہر نکلی تو اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا اور سارا بند یوں دکھ رہا تھا جیسے کسی نے روئی کی طرح دھنک دیا ہو۔ یاقوت نے جلدی سے آگے بڑھ کر کلثوم کو تھام لیا۔

''فکر نہ کرو۔ مصیبت کٹ گئی ہے۔''

''میری جان نکل گئی۔۔۔۔۔۔۔''

اس کے آگے کلثوم کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا اور زبان نے بولنے سے انکار کر دیا۔ یاقوت نے جلدی سے اسے ٹیکسی میں سوار کیا اور ہوٹل لے آیا۔ کمرے میں آ کر اس نے کلثوم کو لٹا دیا اور مالٹوں کا رس منگوا کر گھونٹ گھونٹ کر کے پلایا۔ اسے طاقت کی گولیاں اور ڈاکٹرنی کی تجویز کردہ دوائی کھلائی اور کرسی قریب کھینچ کر ہولے ہولے اس کا سر دبانے لگا۔ کلثوم نے آنکھیں کھول کر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مسلسل ایک گھنٹے کے آرام کے بعد کلثوم کو کچھ ہوش آیا اور اس قابل ہوئی

کہ بات کر سکے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"ابھی نہ اٹھو کلثوم! کچھ دیر اور لیٹی رہو۔ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

کلثوم نے بالوں کو درست کر کے سر پر دوپٹہ اوڑھتے ہوئے کہا۔

"مجھے گھر جانا ہے۔ سہیلی کے ہاں جانے کا بہانہ کر کے آئی تھی۔ شام ہو رہی ہے۔ مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔ ماں فکر کر رہی ہو گی۔"

ماں کا تو فکر ختم ہو گیا ہے۔ اب اسے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کلثوم کے منہ سے "ماں" کا لفظ یاقوت کو بڑا پیارا لگا۔ اس کا جی چاہا کہ کلثوم کے ہونٹ چوم لے جو سفید ہو رہے تھے۔ اس کی لمبی پلکوں والی آنکھوں کے نیچے حلقے نمودار ہو گئے تھے۔ یاقوت نے پوچھا۔

"گھر والوں کو کیا کہو گی؟ تمہاری تو صورت دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ تم بے حد بیمار ہو۔"

"ماں سے کہہ دوں گی کہ سہیلی کے گھر بیمار ہو گئی تھی۔ کمر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ اس کی تسلی ہو جائے گی۔"

اور سہ سب کو تسلی کر دے گی۔ ماں مطمئن ہو جائے تو پھر سب ٹھیک ہوتا ہے۔ یاقوت نے گرم گرم کافی منگوا کر اس کی ایک پیالی کلثوم کو دی۔

"اسے پی جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور ہاں ڈاکٹر نے کہا ہے کہ کچھ روز بستر پر سے بالکل نہیں اٹھنا۔ یہ دوائیاں میں نے خرید لی تھیں۔ یہ پیکٹ اپنے پرس میں رکھ اور نسخے پر جو ہدایات لکھی ہیں ان کے مطابق اسے برابر استعمال کرتی رہنا۔ مجھے میرے ہوٹل والے ایڈریس پر اپنی خیریت کی اطلاع دیتی رہنا۔ نہیں تو میں پریشان رہوں گا۔"

یہ سن کر کہ یاقوت اس کی خاطر پریشان ہو گا کلثوم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اس شخص کا احسان ساری زندگی نہیں بھلا سکتی تھی۔ اسے اس سے بے حد محبت ہو گئی تھی۔ اسے اب محسوس ہوا تھا کہ اس کی زندگی میں پہلی بار داخل ہونے والا مرد یہی تھا۔ کاش! اس کی زندگی میں پہلا قسم یاقوت کا پڑتا۔ کاش وہ اپنی زندگی کے پیڑ کا پہلا پھول یاقوت کے قدموں پر نچھاور کرتی! کاش کاش! کلثوم مجسم پچھتاوا سرتاپا عبرت کی تصویر بنی پلنگ پر کافی کا پیالہ ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ یاقوت نے جیب سے رومال نکال کر کلثوم کی آنکھیں پونچھیں اور محبت بھری گہری آواز میں کہنے لگا۔

"رات گزر گئی ہے کلثوم! دن کی روشنی پھیل گئی ہے اب رو نہیں۔ میں جو تمہارے پاس ہوں۔ تمہارے ساتھ ہوں۔ پھر تم دکھی

کیوں ہوتی ہو؟''

کلثوم نے بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔

''مجھے ڈر لگتا ہے؟''

''کس سے؟ مجھ سے؟''

کلثوم نے اپنا ہاتھ یاقوت کے کندھے پر پیار سے رکھ دیا۔

''نہیں نہیں۔تم سے کیوں؟''

یاقوت کو یوں محسوس ہوا جیسے جنگل میں چلتے چلتے کسی درخت کی پھولوں بھری ٹہنی اس کے کندھے سے آ لگی ہو۔کلثوم پہلی بار یاقوت کو محبت کی گہری اور مسلسل نظروں سے دیکھ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں پیار کے ان گنت ننھے ننھے دیے جگمگا اٹھے تھے اور ان کی روشنی میں سارا کمرہ بقعہ نور بن گیا تھا۔

''پھر کس سے ڈرتی ہو کلثوم؟''

کلثوم نے گہرا سانس لیا اور پیالی میز پر رکھ دی۔

''ڈرتی ہوں۔۔۔۔۔۔۔کہیں تم بھی مجھے چھوڑ کر نہ چلے جاؤ کہیں تمہیں بھی یہ خیال نہ آ جائے کہ کلثوم گناہگار ہے کلثوم۔۔۔۔۔۔''

وہ بے اختیار سسکیاں بھر کر رونے لگی۔یاقوت نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔وہ اس کے ٹھنڈے بیمار گالوں کو محبت سے سہلانے لگا۔اسے وہ لمحہ یاد آ گیا جب اس نے چوک میں پنواڑی کی دکان کے پاس کھڑے ان گالوں کی ایک فتنہ خیز جھلک دیکھی تھی۔جب ان گالوں کے اوپر سنہری جھومر جھوم رہے تھے آسمان پر سورج چمک رہا تھا اور پورے کھلے ہوئے گلاب جھولیاں بھر بھر خوشبوئیں لٹا رہے تھے۔

''ایسا کبھی نہ ہوگا کلثوم! میں تمہیں بے داغ سمجھتا ہوں۔میرے نزدیک تمہاری شخصیت بے عیب ہے۔تم کنول کے پھول کی مانند ہو جو کیچڑ میں رہ کر بھی شفاف رہتا ہے۔عورت کی عصمت کے بارے میں میرے خیالات دوسرے لوگوں سے مختلف ہیں۔اگر میں ان خیالات کا اظہار کرنے بیٹھ جاؤں تو ہو سکتا ہے تم انہیں پوری طرح سمجھ بھی نہ سکو۔تمہارے لئے اتنا کافی ہے کہ میں تمہیں باعصمت سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سمجھتا رہوں گا۔''

کلثوم کی ساری تکلیف ایک دم دور ہوگئی۔ اس کے بدن میں درد کی جگہ زندگی کا تازہ خون گردش کرنے لگا۔ محبت میں بڑی قوت ہوتی ہے۔ پیار ہمدردی کا ایک بول برسوں کی اداسی ایک پل میں دھوڈالتا ہے۔ کلثوم کا چہرہ ایک بار پھر شگفتہ ہوگیا۔ اس کے کانوں کی لویں گرم ہوکر جلنے لگیں۔ اس کا سارا خوف اور ملال جاتا رہا اور دل ایک نئے جوش' نئے ولولے کے ساتھ دھڑکنے لگا۔

یاقوت نے اپنے لب کلثوم کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ پیار کا یہ بوسہ قوس قزح کی ایک رنگین لہر تھی جس نے جسم کے دو گہرے پرشور دریاؤں کو آپس میں ملا دیا تھا۔ اس پیار میں لذت بھی تھی اور حیرت بھی! درد بھی تھا اور درد کی دوا بھی! گھنے تاریک جنگل میں سورج کی پہلی کرن کا سنہری تیر کمان سے نکل گیا تھا اور اب ساری دھرتی پر کرنوں کی برسات ہونے لگی تھی۔ خوشبوؤں کی گھٹائیں امڈ پڑی تھیں۔ روشنیوں کا سیلاب ابل پڑا تھا۔ دو سینوں میں ایک ہی دل اور دو دلوں میں ایک ہی گیت دھڑک رہا تھا۔ یاقوت نے کلثوم کی آنکھوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ جیسے شبنم میں بھیگے پھولوں پر منہ رکھ دیا ہو۔ ہر پنکھڑی سے خوشبو کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ ہر لہر خوشبودار پھولوں کی بارش برسا رہی تھی۔ اس نے کلثوم کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لئے۔ اسے یوں لگا گویا اس کی مٹھی میں دنیا بھر کا خزانہ آ گیا ہو۔ چمکتا ہوا سورج آ گیا ہو۔ اس نے ان ہاتھوں کو چوم لیا اور اس کا چہرہ سنہری ہوگیا۔ کلثوم لذت و سرور کے اس مقام پر تھی کہ اس کا دل اپنی دھڑکن بھول گیا تھا۔ اس قدر گہری تیز خوشبو میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ اتنی چمکیلی روشنی میں اس کی آنکھیں چندھیانے لگیں۔ وہ جلدی سے الگ ہوگئی۔

''میں۔۔۔۔۔۔۔۔میں جاتی ہوں۔''

یاقوت اسے چھوڑنے نیچے ہوٹل کی لابی تک آیا۔ ٹیکسی کا دروازہ کھول کر کلثوم کو اندر بٹھلایا اور خود کھڑکی کے ساتھ لگ کر کہنے لگا۔

''اپنا خیال رکھنا کلثوم''

ٹیکسی سٹارٹ ہوکر چل دی۔ کلثوم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جب ٹیکسی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو یاقوت اپنے کمرے میں آ گیا۔

مدت کے بعد اس کا دل آج محبت کے احساس سے ایک بار پھر دھڑکنے لگا تھا۔ کمرے میں ابھی تک کلثوم کے کپڑوں سے اٹھنے والی دوائی کی ہلکی ہلکی بو بسی ہوئی تھی۔ پلنگ پر جہاں کلثوم بیٹھی تھی چادر پر شکنیں پڑی تھیں۔ سفید تکیے کے ساتھ اس کے سر کا ایک بال چپکا ہوا تھا۔ یاقوت نے آہستہ سے وہ لمبا سیاہ اور باریک بال اٹھایا' اسے انگلی کے گرد لپیٹ کر اس کا چھلا بنایا اور ایک ڈبیا میں بند کر

کے الماری میں رکھ دیا اسے بچپن میں سنی ہوئی کہانیاں یاد آ گئیں جن میں پریاں اپنے عاشقوں کو سر کا بال دے کر کہہ جایا کرتی تھیں کہ جب کبھی میری یاد ستائے اس بال کو آگ دکھانا حاضر ہو جاؤں گی۔ جب وہ ڈبیہ کو الماری میں رکھ کر دروازہ بند کرنے لگا تو اس کی نظر اخروٹ کے اس ڈبے پر پڑ گئی۔ جس میں نجمہ کے محبت بھرے خطوط رکھے تھے۔ یاقوت نے صندوقچی باہر نکالی اور پلنگ پر رکھ کر اس کا ڈھکنا کھول دیا۔ حنا کے عطر کی اڑی سی مہک اٹھنے لگی۔ نجمہ کے خط ویسے کے ویسے پڑے تھے۔ گلاب کی پنکھڑیاں مرجھا کر سوکھ گئی تھیں اور ان کا رنگ براؤن ہوتا جا رہا تھا۔ یاقوت کو بھولی بسری محبت کا ایک ایک رنگین لمحہ یاد آنے لگا۔ ان لمحات کے رنگ پھیکے پڑ گئے تھے۔ شوخی ختم ہو چکی تھی۔ تازگی ماند پڑ گئی تھی۔ اس نے ایک خط کھولا پڑھنے لگا۔

''پیارے یاقوت! کل جب تم نے زبردستی مجھے سیڑھیوں میں پکڑ لیا تھا تو خدا کی قسم میرا دل اتنے زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ معلوم ہوتا تھا ابھی سینے سے باہر آ جائے گا۔''

ہائے میری جان تم اس طرح مجھے اچانک نہ پکڑا کرو۔

کم از کم ایک روز پہلے اطلاع دے دیا کرو تاکہ میں تم سے ملنے کے لئے تیار ہو جاؤں۔ گھر پہنچی تو دل اسی طرح دھڑک رہا تھا اور دماغ میں تمہاری میٹھی میٹھی باتیں گونج رہی تھیں۔ ہائے! تم کتنی پیاری باتیں کرتے ہو۔ پچھلی دفعہ جب میں سکول سے واپس گھر آ رہی تھی تو تم نے بیری والے کنوئیں کے پاس یاد ہے کیا کہا تھا؟ مجھے تو سچ بڑی شرم آئی تھی۔ اچھا اب کی ملاقات ہوئی تو ساری باتوں کی خبر لوں گی۔ ننھے قاصد کو تم نے کل دو روپے دیئے تھے؟ وہ مجھے دکھا رہا تھا۔ پھر مجھے بھی ایک روپیہ دینا پڑا۔ بھابی کی طبیعت خراب ہے۔ یہ بڑا اچھا ہے۔ ان کی مزاج پرسی کے بہانے میں کل تمہارے ہاں آ سکوں گی خدا کرے کہ ابھی بھابی بیمار رہے۔۔۔۔۔۔۔!''

یاقوت نے خط بند کر کے دوبارا صندوقچی میں رکھ دیا۔ اس خط میں پرانی اور زخم خوردہ محبت کے نوحے بلند ہو رہے تھے۔ پھر اس نے نجمہ کا آخری خط پڑھا جو اسے اسلام پور کے ریلوے سٹیشن پر ملا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ

''۔۔۔۔۔۔۔ہائے! میں کیسے آؤں؟ ماں باپ کو کیسے چھوڑ دوں؟ بڑی بدنامی ہوگی۔ میں تو مر جاؤں گی۔ تم خدا کے لئے کچھ روز اور ٹھہر جاؤ۔۔۔۔۔۔۔''

صندوقچی بند کر کے اس نے الماری میں رکھ دی اور سگریٹ سلگا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کمرہ چھوٹا تھا۔ چوتھے قدم پر وہ دیوار کے پاس پہنچ جاتا۔ آخر وہ اس چہل قدمی سے تنگ آ گیا اور کمرے پر تالا ڈال کر نیچے ہوٹل میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس نے کافی منگوائی اور گرم گرم پانی پینے لگا۔ اسے کچھ بھوک محسوس ہوئی۔ اس نے شامی کباب منگوا لئے اور کھانے لگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر کافی کا ایک گرم

پیالہ پیا اور سگریٹ سلگا کر ہوٹل کے بلیئرڈ روم میں آ گیا۔ یہاں اس کی جان پہچان کے کچھ بلیئرڈ کھیل رہے تھے۔ ان کے ساتھ دور دور سے مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور یاقوت ایک کرسی پر بیٹھ کر ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ اس کے خیالات ابھی تک نجمہ اور کلثوم کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ نجمہ سے اس نے بے حد محبت کی تھی۔ محبت کرنے سے پہلے اسے دیکھا تھا۔ اس کی نسواری آنکھوں' سنہرے بالوں اور رخسار کے سیاہ تل کو پسند کیا تھا۔ کتنی دیر اسے دور دور سے دیکھ کر اپنے آتش عشق کو بھڑکا تا رہا تھا۔ پھر جب اس نے نجمہ کو پہلا محبت نامہ لکھا تو وہ اس کی محبت میں سر سے لے کر پاؤں تک جکڑا جا چکا تھا۔ لیکن کلثوم کے ساتھ بالکل مختلف بات ہوئی تھی۔ کلثوم تو اتنی گھبرائی ہوئی چال اور گلابی ایڑیوں کی ایک جھلک دکھا کر ہی اسے اپنا دیوانہ بنا گئی تھی۔ وگرنہ وہ کبھی اس کا تعاقب نہ کرتا۔ اس نے آج تک کبھی کسی لڑکی کا پیچھا نہ کیا تھا۔ وہ اسے انتہائی گھٹیا بات سمجھتا تھا کہ خواہ مخواہ ایک لڑکی کا تعاقب کیا جائے۔ کلثوم کی شکل تو اس نے اس وقت دیکھی تھی جب وہ اس کی محبت میں پوری طرح ڈوب چکا تھا یہ تو اس قسم کی محبت تھی کہ اگر کلثوم اسے کبھی نہ ملتی تو وہ ساری زندگی اس کی یاد میں تڑپتا رہتا۔

یاقوت کے ذہن میں نثریہ اشعار کے ٹکڑے اترنے لگے۔ اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور اس پر اشعار درج کرنے لگا۔ بلیئرڈ روم میں سگرٹوں کا دھواں بھرا ہوا تھا جس کی وجہ سے بلب کی روشنیاں مدھم ہو رہی تھیں۔ سبز میز پر سرخ اور سفید گیندیں لکڑیوں کی ٹھوکر کھا کر لڑھک رہی تھیں اور ان پر جھکی ہوئی کھلاڑیوں کی آنکھیں اور پیشانیاں چمک رہی تھیں۔ اشعار درج کرنے کے بعد یاقوت نے نوٹ بک جیب میں رکھ لی اور سگریٹ پاؤں تلے مسل کر اٹھا۔

''یاقوت صاحب! جا رہے ہیں؟''

واقف کاروں میں سے کسی نے پوچھا۔ یاقوت نے مسکرا کر کہا۔

''جی ہاں۔''

ہوٹل سے نکل کر وہ سیدھا پری کی جانب چل پڑا۔ کلثوم کی بیماری کے چکر نے اسے پریشان کر دیا اور وہ پری کے پاس جا کر اپنا اداس دل بہلانا چاہتا تھا۔ رات ہو گئی تھی۔ میکلوڈ روڈ پر سردی کے باوجود زندگی رواں دواں تھی۔ ہوٹلوں کی بتیاں جگمگا رہی تھیں اور اندر بڑی رونق تھی۔ یاقوت گلیوں میں سے ہوتا ہوا پری کے ہاں پہنچ گیا۔ وہ حسب معمول دکان کا پٹ بند کئے اندر کام کر رہا تھا۔ یاقوت اندر آ گیا۔

''آ میرے یاقوت راجہ بیٹھو۔۔۔۔۔۔۔۔''

یاقوت ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ پرسی نے بلب کو اپنے سر کے اوپر لٹا رکھا تھا اور ایک بورڈ پر کسی تصویر میں رنگ بھر رہا تھا۔

یاقوت نے پوچھا۔

''یہ سنتوش کمار کی تصویر ہے کیا؟''

پرسی ہنس پڑا۔ برش اینٹ پر رکھا۔ سگریٹ کا بجھا ہوا ٹکڑا دوبارہ سلگایا اور بولا۔

''یار تم بھی سینما کے منیجر ایسی باتیں کرنے لگے۔ لالہ! یہ سنتوش کمار نہیں بلکہ بھوشن ہے۔ ابھی رنگ پورے نہیں بھرے گئے اس لئے نقش نہیں ابھرے۔ تم سناؤ کہاں سے آ رہے ہو؟''

یاقوت نے گہرا سانس بھر کر کہا۔

''ہوٹل سے آ رہا ہوں۔''

یاقوت کے گہرا سانس لینے پر پرسی نے سر ہلا کر پوچھا۔

''لالہ! یہ ٹھنڈی آہیں کیوں بھرنے لگے؟ کہیں عشق وشق تو نہیں ہو گیا؟ ارے بھائی اس عشق نے ہر گھر کو برباد کیا۔ اس نے مہینوال کی ران چیری۔ اس نے سوہنی کی چناب میں ربڑی کی۔ اس نے سسی کو ہروایا۔ اور تو اور یہ میری بھی ربڑی کر رہا ہے۔ اس روز ایلس میرے ساتھ تھی ناں! اب پچھلی اتوار کو وہ پیڈرو کے ساتھ گئی ہوئی تھی ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔۔۔ میں تو سینے پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔ مگر کیا کروں بھائی! مجبوری ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ بادشاہ زادی ہے۔ اس کی جس کے ساتھ مرضی ہوتی ہے چلی جاتی ہے۔ میں عشق کے ہاتھوں مجبور ہوں۔ اگر کچھ کہہ بیٹھا تو کبھی کبھار کے درشنوں سے بھی چھٹی مل جائے گی۔''

پھر وہ برش اٹھا کر بھارت بھوشن کے ناک پر پھیرنے لگا۔

''لاہور ہوٹل والے بیرے کے بیس روپے ہو گئے ہیں۔ تین دفعہ مسلسل ایلس وہاں بیٹھ کر میرے حساب سے زیادہ کھا گئی اور مجھے ہر بار بیرے کی منت سماجت کرنی پڑی۔ ویسے میں اس کمینے کو منہ نہ لگاتا لیکن عشق نے یہاں میری ربڑی کر دی۔ یہ بورڈ جو بنا رہا ہوں اس کے کل پچاس روپے بنتے ہیں۔ تیس روپے سگریٹ والے کو دوں گا۔ باقی کتنے بچے؟''

''تیرہ۔'' یاقوت نے کہا۔

''تیرہ میں سے چار روپے حکیم کو واپس کرنے ہیں باقی رہے نو روپے اور اتوار پھر سر پر ہے۔ اس بار ایلس ضرور میرے پاس آئے گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ پچھلی اتوار کے ناغے کی بھی کسر نکالے گی اور خوب ڈٹ کر کھائے گی اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے پھر کسی

نہ کسی بیرے سے قرض مانگنا پڑے گا۔ہائے ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔۔۔

لالہ یاقوت!ہم کیا خاک عشق کر سکتے ہیں!

ارے بھائی عشق کرنے کے لئے تو فیصل آباد میں کپڑے کی ایک مل ہونی چاہئے۔اپنا نہا دھو کر بہترین تھری پیس سوٹ پہن کر کار میں سوار ہو کر مال پر نکلے اور اپنی معشوقہ کے ساتھ انڈس میں بیٹھ کر واٹ سکسٹی نائن کے دو دو پیگ لگائے۔شیزان میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔پلازا کے بکس میں فلم دیکھی اور گلبرگ کی کوٹھی کے گرم بیڈ روم میں آ کر ریشمی بستر پر دراز ہو گئے۔ہائے ہائے ہائے!کیا بات کر گیا ہوں میں بھی۔ہم دس مرتبہ پیدا ہوں تو بھی یہ چیز نصیب نہیں ہو سکتی۔یہاں تو سوائے قرض 'بھارت بھوشن کی لمبی ناک اور چرس کے اور کچھ نہیں۔لنڈے سے پچھلے سال ایک سوٹ بارہ روپے میں مل گیا تھا۔ہر اتوار کو اسے پہن کر ایلس کے ساتھ جاتا ہوں۔ہفتے کی ساری رات اسے برش مار مار کر صاف کرتے گزر جاتی ہے۔ایک روز اس ظالم نے بھی کہہ ہی دیا کہ ڈیئر پرسی!تمہارے پاس بس یہ ایک ہی سوٹ ہے؟ وکٹر تو ہر اتوار کو نیا سوٹ پہن کر آتا ہے۔لالہ!میرا کلیجہ جل گیا۔مگر کیا کر سکتا تھا؟بات کو گل کر گیا۔خدا کی قسم اگر اس لڑکی کو مفت کھانے کی بیماری نہ ہو تو وہ مجھے کبھی کا چھوڑ گئی ہوتی۔وہ جتنی دیر میرے ساتھ رہتی ہے بکری کی طرح چرتی رہتی ہے۔وہ ایک منٹ میں ایک روپے کا نوٹ چر جاتی ہے۔''

پرسی خود ہی ہنس پڑا اور چرس بھرا سگریٹ زمین پر رگڑ کر بجھانے لگا۔دکان کی بند فضا میں چرس کی ناگوار بو پھیل گئی تھی۔یاقوت کو یہ بو صرف اس لئے گوارا تھی کہ وہاں کا ماحول زندگی سے بھرپور تھا۔اگرچہ وہاں اس کے سامنے صرف ایک معمولی رنگساز بیٹھا تھا جس کے پاس پچھلے چار سال سے اتنے پیسے بھی نہ ہوئے تھے کہ وہ ایک نئی پتلون ہی بنوا سکے اور جو صبح سے شام تک بورڈ لکھتا تھا اور چرس پیتا تھا۔جو کمزور تھا۔جو شاید بیمار بھی تھا۔جو ایک ہرجائی عورت سے پیار کرتا تھا اور جو اس دکان میں 'اس محلے میں 'اس شہر اور ملک میں بالکل اکیلا رہتا تھا۔یہاں نہ اس کی ماں تھی نہ بہن نہ بھائی۔جس کی زندگی میں چرس معمولی معاوضے کا انتھک کام 'لنڈے کا ایک پرانا سوٹ 'مٹی کا گھڑا اور ایک بے وفا محبوبہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا لیکن جس کی رگ رگ میں زندگی بسر کرنے کا جوش اور کام کی لگن بھری ہوئی تھی۔یاقوت پرسی کی ان باتوں کو پسند کرتا تھا۔پرسی زندگی اس لئے بسر کرتا تھا کہ وہ ایک بہترین بسر کرنے والے شے تھی۔اس کے مقابلے میں حکیم اس لئے ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا تھا کہ اسے موت کا خوف تھا اور وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔موت کے خوف نے اسے لذت پرست اور اپنی غرض کا دیوانہ بنا دیا تھا۔اس لذت پرستی نے اس کے ہاتھوں ایک انسان کو مروا دیا۔تانبے کا کشتہ اس نے دراصل اپنے لئے بنایا تھا لیکن جب تک وہ کسی دوسرے آدمی پر آس کا تجربہ نہ کر لیتا وہ اسے کھانا نہیں چاہتا تھا۔چنانچہ تجربہ کیا

گیا۔ تجربے نے کشتے کو ناقص قرار دیا اور بڈھے کمہار کی جان لے لی۔

لیکن پرسی خوش دل مست بیراگی تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی ماں کو اور اپنے جالندھر والے مکان کو یاد کر کے اداس ہوتا مگر اس کی اداسی بھی ایک قسم کی رومانٹک افسردگی ہوتی۔ اس کے برعکس یاقوت نے خوشی کے لحات میں بھی حکیم کی آنکھوں میں خوف اور تشویش کی مردنی دیکھی تھی۔

''لالہ! کیا بج گیا ہے؟''

یاقوت نے گھڑی دیکھ کر وقت بتایا تو اس نے برش ایک طرف رکھ دیا چرس کا دوسرا گیٹ جلایا۔ اس کے دو تین لمبے لمبے کش لگائے اور لال لال آنکھیں جھپکا کر بولا۔

''ماں نے پیغام بھجوایا ہے کہ پرسی سے کہو میرے پاس جالندھر آ جائے۔ میری آنکھیں اس کی صورت کو ترس گئی ہیں۔''

اتنا کہہ کر پرسی خاموش ہو گیا۔ اس کا نچلا ہونٹ لٹک گیا اور آنکھوں میں دل گداز اداسی چھا گئی۔

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟''

پرسی کے چہرے پر زہر خند کے لہریں ابھریں۔

''کیا جواب دیتا؟ میرا دل خود اس سے ملنے کو تڑپ رہا ہے۔ لیکن ایلس کو کیسے چھوڑ دوں؟ میں نے کہلوا بھیجا ہے کہ پیاری ماں میں یہاں بڑی محنت سے کام کر رہا ہوں اور ڈھیروں روپے کما کر بہت جلد تمہارے پاس آ جاؤں گا مگر میں جانتا ہوں کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ نہ میں ڈھیروں روپے کما سکوں گا اور نہ ماں کے پاس جالندھر جا سکوں گا۔ ایلس نے میرے دونوں پاؤں میں لوہے کی زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔ نہ خود ملتی ہے اور نہ مجھے ادھر ادھر ہونے دیتی ہے۔ اب تو اسی ایک امید پر زندہ ہوں کہ ایلس سے شادی ہو جائے اور اسے ساتھ لے کر ماں کے قدموں میں پہنچ جاؤں۔ ہاتھ میں ہنر ہے جس جگہ بھی جاؤں گا کما کر کھا سکوں گا۔''

یاقوت نے پوچھا۔

''اور اگر ایلس نے وکٹریا پیڈرو سے شادی کر لی تو کیا کرو گے؟''

پرسی کا حلق کڑوا ہو گیا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش لگایا۔ دھواں باہر نکالا اور سر ہلاتے ہوئے مسکینی سے مسکرا کر بولا۔

''کیا کر سکتا ہوں! بس بھارت بھوشن کے بورڈ بناؤں گا۔ چرس پیوں گا۔ گھڑا بجا کر گاؤں اور ایلس کو ہر اتوار اس کے خاوند کے

ساتھ گرجے میں دیکھ کروں بہلالیا کروں گا اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔

ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔۔۔کیسا ظلم ہوگا میری جان پر اگر ایلس نے وکٹر سے شادی کر لی!''

پرسی نے سگریٹ پھینک کر زور سے تھوکا اور منہ پر دونوں ہاتھ مل کر بولا۔

''بس اب کام نہیں ہوتا لالہ!''

اتنا کہہ کر اس نے کونے میں سے گھڑا اٹھایا اسے گود میں رکھا۔ سر جھکا دیا اور گھڑا بجاتے ہوئے بڑی سوکھی اور بے رس مگر درد بھری آواز میں گانے لگا۔

شالا وگدی اے راوی......وچ آیا اے بریتا

سانوں ایس جدائی دا......کوئی چت نہ چیتا

(راوی بہہ رہا تھا کہ بیچ میں ریت کا ٹاپو آ گیا

آہ! ہمیں تو اس جدائی کا وہم وگمان بھی نہ تھا)

شالا چھڈ گیوں کلی......ساڈا ہورای کیہڑا

سانوں لکھ وی نہ دیوے......تیرا خالی ویہڑا

(میرے محبوب! تو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ بھلا میرا اور کون تھا؟ مجھے تو تیرے خالی مکان کے آنگن میں سے سوکھے پتے بھی نہیں مل رہے۔)

پرسی کی آواز درد اور محبت کی آگ میں جھلسی جا رہی تھی۔ گھڑے کی آواز بوجھل اور غمگین ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ وہی گھڑا ہو جس پر لیٹ کر سوہنی دریائے چناب پار کر لیا کرتی تھی۔ پنجابی گیت کی لے ست اور طرز اداس تھی۔ اگر اس گیت اور اس کی سوگوار لے کو خوشبو میں تبدیل کر دیا جاتا تو وہ یقیناً حنا کی باسی مہک بن جاتی جو پرانے محبت بھرے خطوط کی صندوقچی سے اٹھ رہی ہو۔ پرسی کا دل رو رہا تھا۔ اپنی پیاری ماں کے لئے جو جالندھر میں تھی۔ اور جس کی صورت نے اس نے کئی سالوں سے نہیں دیکھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے ایلس کے لئے جس کی صورت وہ روز دیکھتا تھا لیکن جو وکٹر کی آغوش میں تھی جس کی باہیں پیڈرو کے گلے میں تھیں۔ جس کے دل میں پرسی کے لئے ذرا سی بھی محبت نہ تھی اور جو محض اس کا مال ہضم کرنے کے لئے

اس سے ملتی تھی اور پرسی ہوٹلوں کے بیروں سے ادھار لیتا پھرتا تھا۔ یہ حقائق اس قدر تلخ تھے کہ ان کا زہر پرسی کے جسم میں

سرایت کر گیا تھا۔اب اسے گانا بھی زہر لگنے لگا۔اس نے گھڑا ایک طرف رکھ دیا۔برش دوبارا ہاتھ میں لے کر ایک گہرا سانس لیا اور بے دلی سے بورڈ پر ادھر ادھر پھیرنے لگا۔تھوڑی ہی دیر بعد بورڈ پر رنگ آمیزی کے کام نے پرسی کی ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور وہ بڑے جوش وخروش سے کام میں لگ گیا۔وہ آنکھیں ذرا سی بند کر کے سر پیچھے لے جا کر تصویر کو غور سے دیکھتا اور پھر برش پھیرنے لگتا۔

''لالہ! کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ تمہاری بھی زندگی کتنے مزے کی ہے۔گاؤں سے پیسے آجاتے ہیں اور ہوٹل میں بیٹھے عیش کرتے ہو۔نہ کوئی فکر نہ فاقہ۔ایک ہم کہ رات رات بھر اکڑوں بیٹھے بورڈ بناتے رہتے ہیں۔

پچاس کا کام کرتے ہیں تو پچیس ملتے ہیں۔''

یاقوت مسکرایا اور رومال سے ناک پونچھ کر بولا۔

''لیکن کام تو کرتے ہو۔میری سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ میرے پاس کوئی کام ہی نہیں ہے۔ہوٹل سے نکل کر ادھر آجاتا ہوں۔ادھر سے حکیم کے پاس جاتا ہوں اور وہاں سے پھر ہوٹل واپس پہنچ جاتا ہوں۔''

پرسی نے نیم وا آنکھوں سے بھارت بھوشن کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہیں یہ فکر تو نہیں ہے ناں کہ کل اگر پیسے نہ ملے تو بیرے سے اور ہار کرنا ہوگا اور سگریٹ والے دوسرے ہفتے پر ٹالنا ہو گا۔''

یاقوت نے آہستہ سے کھنکار کر کہا۔

''میرے فکر اور ہیں۔میری پریشانیاں دوسری قسم کی ہیں۔''

پرسی بولا۔

'' کچھ بھی ہو دنیا میں بھوک سے زیادہ خوفناک کوئی پریشانی نہیں ہے آدمی ہر پریشانی میں اپنا وقار برقرار رکھ سکتا ہے لیکن بھوکے آدمی کی جو چیز سب سے پہلے ربڑی کرتی ہے وہ اس شخصی وقار ہوتا ہے۔''

یاقوت نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آج تم بڑے فلسفی بن گئے ہو' کیا بات ہے؟''

پرسی نے منیجر کو موٹی سی گالی دے کر کہا۔

''آج کمینے نے مجھے پانچ روپے نہیں دیئے۔''

اس کے بعد یاقوت نے سگریٹ سلگا لیا۔ پرسی چرس کی ترنگ میں بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس کا برش والا ہاتھ بڑی تیزی سے بورڈ پر چل رہا تھا۔ اس نے برش کی ڈنڈی سے اپنی گردن کھجا کر کہا۔

''یار! کسی وقت خیال آتا ہے کہ میں کسی امیر آدمی کے گھر کیوں نہ پیدا ہوا؟ میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟''

پرسی نے گردن یاقوت کی طرف جھکالی۔ اس کی لال لال نشہ آلود آنکھوں میں چمک آ گئی۔

''یہاں مال روڈ کی جانب ایک کوٹھی ہے۔ وہاں پچھلے دنوں مجھے ایک کام مل گیا۔ کام یہ تھا کہ ساگوان کی چار بڑی الماریوں پر رنگ کرنا تھا۔ جس کمرے میں رنگ کر رہا تھا وہاں پاس ہی دیوار سے ایک تجوری لگی تھی۔ میرے سامنے کوٹھی کے ٹھگنے قد کے بدشکل بڈھے مالک نے شیروانی سے کنجیاں نکال کر تجوری کھولی اور ایک شخص کو سوسو کے کتنے ڈھیر سارے نوٹ گن کر دیئے۔ نوٹوں کی گڑگڑ کرتی آواز نے مجھے کانی آنکھ سے ادھر دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ تجوری سوسو کی گڈیوں سے بھری ہوئی تھی۔ بڈھے مالک نے نوٹ دے کر تجوری بند کر دی اور کنجیاں شیروانی کی جیب میں رکھ کر چلا گیا۔ ہائے ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔۔۔! خدا کی قسم اس کے بعد میرا کام سے جی اچاٹ ہو گیا۔ میں نے سوچا میرے کام کی حیثیت کیا ہے؟ یہی تین روپے فی الماری۔۔۔۔۔۔۔ یعنی کل بارہ روپے! اور بارہ روپوں کی اس نوٹوں سے بھری ہوئی تجوری کے آگے کیا حیثیت ہے؟ میرا جی چاہا کہ تجوری کو توڑ کر سارے نوٹ نکال کر جھولی بھروں اور دو دو گیارہ ہو جاؤں۔''

پرسی نے ایک سرد آہ بھری اور برش والا ہاتھ بورڈ پر لاپروائی سے پھیرنے لگا۔

''اگر کسی طرح وہ تجوری میری دکان میں آ جائے تو ایلس دس ہزار عاشقوں سے ناطہ توڑ کر دوڑی دوڑی میرے پاس آئے۔ وہ فوراً مجھ سے شادی کر لے۔ جتنی دیر میں اس کمرے میں الماریوں پر رنگ کرتا رہا میرے دل میں طرح طرح کے خیالات چکر لگاتے رہے۔ کوٹھی کے اس سجے ہوئے کمرے میں میری گھڑیاں عذاب کے لمحات میں بدل گئیں۔ جب میں اپنی مزدوری بارہ روپے لے کر کوٹھی سے باہر نکلا تو مجھے دنیا کی ہر شے پھیکی اور بے رنگ لگ رہی تھی۔ میں نے اس بڈھے کوٹھی والے کے بیٹے کو بھی دیکھا۔ مجھ سے بھی زیادہ کمزور اور بدشکل تھا۔ مگر بڑے خوبصورت کپڑے پہن رکھے تھے اور اپنی خوبصورت شیشے کی طرح چمکتی ہوئی نازک بیوی کے ساتھ کار میں بیٹھ کر باہر نکل گیا۔ میرا دل کباب ہو گیا۔ آخر میں نے خدا کا کیا نقصان کیا ہے جو اس نے مجھے ایک غریب گھر میں پیدا کیا۔ ماں بہن کو مجھ سے جدا کر کے یہاں پردیس میں لا پھینکا جہاں دن رات چکی پیستا ہوں اور گزارہ پھر بھی نہیں ہوتا۔ ایلس سے

پیار کرتا ہوں اور وہ بھی میری نہیں بن رہی۔ اگر میں اس امیر کوٹھی والے کے ہاں پیدا ہو گیا ہوتا تو آج میرے پاس بھی ایک کوٹھی اور موٹر کار ہوتی۔ میں نے بھی قیمتی گرم سوٹ پہن رکھا ہوتا اور خوبصورت 'خوشبوئیں اڑاتی' گورے بدن والی بیوی کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے کوٹھی کے باغ میں ٹہلا کرتا۔ پھر نہ مجھے ایلس کے لئے بیرے سے ہاتھ جوڑ کر ادھار لینا پڑتا۔ نہ سگریٹ والے کی منت خوشامد کرنی پڑتی اور نہ اٹھنی روز کی چرس پینی پڑتی۔ پھر میں بھی کار میں بیٹھ کر مال پر نکلتا اور سگریٹ منہ میں دبائے حسین بیوی ساتھ لئے چابیوں کی زنجیر گھماتا بڑی شان سے شیزان میں داخل ہوتا۔"

پرسی کا ہاتھ رک گیا تھا اور وہ زمین پر بچھے ہوئے بورئیے کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حسرت و یاس کا اندھیرا تھا اور سوکھا سوکھا منہ لٹک کر زیادہ پژمردہ اور بے جان ہو گیا تھا۔ سر جھٹک کر مسکرایا اور یاقوت کی طرف دیکھ کر بولا۔

"لالہ! یہ تو الف لیلیٰ کی باتیں ہیں۔ کہاں راجہ بھوج اور کہاں گنگو تیلی! اپنا تو کولہو کے بیل والا معاملہ ہے آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہیں۔ کولہو کے گرد گھوم رہے ہیں اور ساری زندگی گھومتے رہیں گے۔ خدا نے ہمیں تو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ ہماری ریڑھی ہوتی رہے۔"

پرسی نے بگلے کی ڈبی سے چرس والا تازہ سگریٹ نکال کر سلگایا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ یاقوت وہاں سے اٹھ کر باہر آ گیا۔ رات پوری طرح چھا چکی تھی۔ یاقوت حکیم کی دکان پر آیا۔ معلوم ہوا حکیم صبح کی گاڑی سے ملتان گیا ہوا ہے۔ طوفا کلرک اس کی گدی پر بیٹھا جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ یاقوت نے پوچھا۔

"ملتان کیا کام تھا؟"

طوفے نے کہا۔

"وہاں کوئی بڑا امیر آدمی ہے۔ اسے ذیابیطس کا مرض ہے اس نے آدمی بھیج کر بلوایا تھا۔ میرا خیال ہے پرسوں تک آ جائیں گے۔ تم آؤ بیٹھو۔"

یاقوت نے ہنس کر کہا۔

"معلوم ہوتا ہے اس آدمی کے دن پورے ہو گئے ہیں جو اس نے حکیم کو بلوایا ہے۔"

"بیٹھو گے نہیں؟"

"سردی بڑھ گئی ہے بھائی۔ کمرے میں ہیٹر لگا کر پڑھنے کا ارادہ ہے۔"

طوفا بھی یہی چاہتا تھا کہ یاقوت دکان میں آ کر نہ بیٹھے کیونکہ اس وقت حکیم کی جواں سال کھلنڈری بیوی داری سیڑھیوں میں پچھلے دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی اور طوفے کو اوپر بلا رہی تھی۔ حکیم اپنی دکان اور مکان اپنے شاگرد خاص اور دوست طوفے کے حوالے کر گیا تھا۔ طوفے نے ڈاک خانے سے دو روز کی چھٹی لے لی تھی۔ داری کو عشق بازی کرنے کے لئے کھلا میدان مل گیا تھا۔ مگر طوفا اب داری سے کترانے لگا تھا۔ کیونکہ داری کی جاب سے بیاہ کا تقاضا شدت اختیار کر گیا تھا۔ اور ظاہر ہے طوفا اس کسی حالت میں بھی شادی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس سے وقتی طور پر عیاشی تو کر سکتا تھا لیکن اپنے استاد اور دوست حکیم سے طلاق دلوا کر اس کی بیوی سے شادی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ صبح سے داری اس کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔ وہ بار بار سیڑھیوں میں آ کر اسے آواز دیتی۔ جب وہ گدی اس کے اردگرد منڈلا رہی تھی۔ وہ بار بار سیڑھیوں میں آ کر اسے آواز دیتی۔ جب وہ گدی سے نہ ہلتا تو دروازے میں آ کر کھڑی ہو جاتی اور اسے اپنے پاس بلاتی۔ دراصل داری ایک بھرپور جوان لڑکی تھی جسے اس کے باپ نے تھوڑے سے روپے لے کر بڈھے سے بیاہ دیا تھا۔ اس کی جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ اب وہ غریب طوفے کو اوپر نہ بلائے تو کیا کرے اور پھر طوفا اس سے نہ صرف اظہار محبت بلکہ شادی کا وعدہ بھی کر بیٹھا تھا۔ داری شلوار کے پائنچے اٹھائے کبھی سیڑھیاں اترتی اور کبھی چڑھ جاتی۔ اس وقت بھی دکان کے بغلی سیڑھیوں والے دروازے میں کواڑ سے لگ کر کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی۔

''اب دکان بند کر دو اور اوپر آ کر روٹی کھا لو ناں! میں کب تک تمہارے لئے بیٹھی رہوں گی؟''

وہ بالکل اسی طرح کہہ رہی تھی جیسے طوفا اس کا خاوند ہو۔ اور طوفا سوچ رہا تھا کہ وہ بھلا دکان بند کر کے محلے والوں کے سامنے کس طرح اوپر جا سکتا ہے۔ جبکہ لوگوں کو معلوم ہے کہ حکیم وہاں نہیں ہے۔ اس نے کہا۔

بھئی میں نے کہہ دیا کہ روٹی یہاں لے آؤ۔ میں اوپر نہیں آؤں گا۔''

داری نے تنک کر جواب دیا۔

''میں کوئی تمہاری لونڈی نہیں ہوں۔ روٹی کھانی ہے تو اوپر آؤ نہیں تو جہنم میں جاؤ۔''

طوفے نے سر جھٹک کر منہ ہی میں داری کو ایک موٹی سی گالی دی اور جاسوسی ناول پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ رات آٹھ بجے کے قریب اس نے دکان بند کی۔ پیسوں کی تھیلی اور چابی حکیم کی چھوٹی لڑکی کے ہاتھ اوپر بھجوائی اور اپنے گھر آ کر کھانا کھا کر لیٹ گیا۔

آدھی رات کو اس کی آنکھ کھل گئی۔ لحاف میں اسے کچھ سردی محسوس ہوئی۔ اسے اچانک داری کے گدرائے ہوئے جوان گرم کا خیال آیا اور اس کے جسم پر چونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ داری ساتھ والے کمرے میں اکیلی سو رہی تھی۔ طوفا ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کی

دونوں جوان بہنیں دیوار کے ساتھ پلنگ پر سو رہی تھیں۔ برابر والی چارپائی پر ماں سو رہی تھی اور پچھلی کوٹھڑی میں بڈھا باپ پڑا تھا۔ چاروطرف گہری خاموشی اور اندھیرا تھا۔ طوفا آہستہ سے چارپائی چھوڑ کر سیڑھیاں چڑھتا کوٹھے پر آ گیا۔ سامنے حکیم کا کوٹھا تھا۔ وہ نصف مرد اونچی دیوار پھلانگ کر حکیم کے کوٹھے پر آ گیا۔ نیچے جانے والی سیڑھیوں کا دروازہ بند تھا۔ طوفے نے دروازے کے قریب آ کر کواڑ کو اندر کی طرف دھکیلا تو معلوم ہوا کہ اندر سے کنڈی لگی ہے۔ طوفے نے سلاخوں والے مگھ کے اوپر آ کر نیچے دو تین روڑے پھینکے۔ روڑے نیچے کھرے میں رکھے ہوئے حمام پر جا کر ٹناٹن لگے۔ داری کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے آواز دی۔

''کون ہے اوپر؟''

طوفے نے سلاخوں کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کہا۔

''میں ہوں داری۔۔۔۔۔۔۔۔طوفا۔۔۔۔۔۔۔۔۔دروازہ کھولو!''

داری نے فوراً جواب دیا۔

''جاؤ اپنی ماں کے پاس جا کر سوؤ۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔''

طوفے نے لجاجت سے کہا۔

''معاف کردو داری! خدا کی قسم تم سے ایک ضروری کام ہے۔''

داری نے تنک کر کہا۔

''میں جانتی ہوں تمہیں کیا کام ہے۔ میں ہرگز دروازہ نہیں کھولوں گی۔''

''مان بھی جاؤ داری! کیا کر رہی ہو۔ ایمان سے اوپر بڑی سرد ہے۔ بس ایک بات کہہ کر واپس چلا جاؤں گا۔ تم سیڑھیوں میں تو آؤ۔''

اندر سے داری کا دل اس خیال سے ناچ رہا تھا کہ آدھی رات کو اس کا عاشق چھت پر آ کر سردی میں اس کی منتیں کر رہا ہے اور نیچے اس کے پاس آنے کو بے تاب ہے۔ جب وہ طوفے کو بہت تنگ کر چکی تو لحاف میں سے نکل کر اس نے چادر اوڑھی اور سیڑھیوں میں آ کر دروازہ کھول دیا۔

''اب کہو کیا بات کرنی ہے؟ جلدی کہو مجھے نیند آ رہی ہے۔''

طوفا اندھیرے میں کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

''میری جان اتنی جلدی بھی کیا ہے۔دیکھو یہاں کتنی ٹھنڈ ہے۔ نیچے جا کر بتانے میں کیا حرج ہے بھلا؟''

''نہیں میں تمہیں ہرگز نیچے نہیں آنے دوں گی۔''

طوفا داری کے گرم گرم جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔داری جسم چرا کر اسے برا بھلا کہتی رہی شکوے شکائتیں کرتی رہی اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نیچے لے گئی۔حکیم کے ساتے بچے ادھر ادھر چار پائیوں پر پڑے سو رہے تھے۔طوفا داری کے ساتھ لحاف میں گھس کر بیٹھ گیا۔داری نے طوف کے سر کے بالوں کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دے کر کہا۔

''اب بتاؤ تم مجھ سے شادی کیوں نہیں کرتے؟ کیا تمہیں یہ خیال ہے کہ میں حکیم کے یہ چھ پلے بھی ساتھ لے کر تمہارے گھر آ جاؤں گی؟ آخر مجھ میں کیا کمی ہے؟ کیا میں جوان نہیں ہوں۔خوبصورت نہیں ہوں؟ پھر تم مجھ سے بیاہ کرتے ہوئے کیوں گھبرا رہے ہو؟''

طوفے نے داری کی مضبوط گرفت سے اپنے بالوں کو آزاد کرتے ہوئے کہا۔

''جانی تم یونہی فکرمند ہوتی ہے۔ میں نے تمہیں ایک بار کہہ دیا ہے کہ شادی کروں گا تو تم سے۔نہیں تو ساری زندگی کنوارا رہوں گا۔''

''لیکن کب شادی کرو گے؟''

''اب اتنی جلدی تو میں تاریخ مقرر نہیں کر سکتا پہلے کم از کم ایک بہن کا بیاہ تو کر لوں پھر فوراً تم سے شادی کر لوں گا۔''

''اور اگر تمہاری بہن کا بیاہ پانچ سال تک نہ ہوا تو؟''

طوفے نے داری کے گالوں پر ہاتھ پھیر کر کہا۔

''میری جان! اتنی دیر کبھی لگ سکتی ہے؟''

داری نے منہ پھلا کر کہا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو۔تم محض اپنا گزارہ چلا رہے ہو۔تمہیں مجھ سے کوئی محبت نہیں ہے لیکن میں اب ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ اگر دو روز کے اندر اندر تم نے مجھ سے شادی کرنے کا فیصلہ نہ کیا تو میں تم سے اپنے سارے تعلقات توڑ لوں گی اور تمہیں کبھی منہ نہیں لگاؤں گی۔''

''جانی! دو روز کی مہلت تو بڑی تھوڑی ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ بس دوروز کے اندر مجھے اپنا فیصلہ بتادو۔ اگر تم نے شادی کا فیصلہ کیا تو میں ایک ہفتے کے اندر حکیم سے طلاق لے کر تم سے شادی کر لوں گی۔ اگر تم نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو پھر میں کچھ اور سوچوں گی۔''

طوفے نے داری کا منہ چوم کر پوچھا۔

''اور کیا سوچو گی میری جان؟''

داری نے منہ پرے ہٹا کر کہا۔

''جو چاہے سوچو۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ میرا کوئی نہیں ہے؟ بس تم ہی دنیا میں شاہ بہرام رہ گئے ہو؟ میں نے ایک جھلک دکھادی تو دیکھنا کتنے لڑکے مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو جائیں گے۔''

طوفے نے سر ہلا کر کہا۔

''ہاں بھئی یہ تو ہم بھی مانتے ہیں تمہارے حسن میں بڑی بات ہے تم تو سارے لاہور شہر کو اپنے پیچھے لگا سکتی ہو۔ لیکن فکر نہ کرو۔ شادی میں ہی تم سے کروں گا۔''

''بکواس بند کرو۔''

داری دوسری طرف منہ کر کے لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ طوفا اسکی دلداری کرنے لگا۔ وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ داری نے جسم سکیڑ لیا۔ طوفا اس کے کانوں کو چومنے لگا۔ داری کا سکڑا ہوا بدن کھلنے لگا۔ اب وہ طوفے کو گالیاں بھی دے رہی تھی اور اس سے لپٹی بھی جا رہی تھی۔ اچانک حکیم کی چھوٹی بچی روتے ہوئے پانی مانگنے لگی۔ داری نے اسے ڈانٹا۔

''ریں ریں بند کر۔ ابھی دیتی ہوں پانی! کمینی! سنکھیا کھالیا ہے تو نے جو اتنی سردی میں پانی پانی کر رہی ہے؟''

داری لحاف میں سے نکل کر باہر آ گئی۔ طوفا وہیں لحاف میں پڑا رہا۔ داری نے بچی کو پانی پلایا۔ پھر اسے تھپک تھپک کر برا بھلا کہتے ہوئے سلایا اور دوبارا اپنے بستر میں آ کر پڑ گئی۔

اس رات طوفا کوئی چار ساڑھے چار بجے داری کے بستر سے نکل کر چھتیں پھلانگتا اپنے گھر آیا اور بستر میں پڑ کر گہری نیند سو گیا۔ اس نے ایک پل کے لئے بھی نہ سوچا کہ داری نے اسے دوروز کی مہلت دی ہے اور اگر اس نے داری سے شادی کرنے کا فیصلہ نہ کیا تو وہ اسے کبھی نہیں ملے گی۔ طوفے کو جس طرح اس بات کا یقین تھا کہ وہ داری سے کبھی نہیں شادی کرے گا اسی طرح اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ داری اس سے ملنا جلنا کبھی بند نہیں کر سکتی۔ وہ کبھی حکیم سے طلاق نہیں لے گی۔ حکیم اسے کبھی طلاق نہیں دے گا۔ وہ

ساری زندگی حکیم کے چنگل میں جکڑی رہے گی اور طوفے سے راتوں کو چھپ چھپ کر ملتی رہے گی اور رات کی تاریکیوں میں ملنے کا سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا جائے گا۔ لیکن گہری نیند سوئے ہوئے بکری کے دل والے طوفے کلرک کو معلوم ہی نہیں تھا کہ داری شیر کے دل والی لڑکی ہے اور جوانی کے منہ زور گھوڑے پر سوار اڑتی پھر رہی ہے اور اس نے اپنے دل میں ایک پختہ فیصلہ کر لیا ہے۔

دو روز بعد حکیم ملتان سے واپس آ گیا۔

طوفے نے گدی حکیم کے حوالے کر دی۔ داری نے کسی بہانے طوفے کو سیڑھیوں میں بلایا اور پوچھا کہ اس نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ طوفے نے مسکرا کر کہا۔

''اری پگلی! شادیوں کے فیصلے اتنی جلدی بھی کبھی ہوئے ہیں؟''

داری کا منہ لال ہو گیا۔ اس نے طوفے کو چھوٹتے ہی دو چار گالیاں سنا دیں اور کہا کہ اگر آئندہ اس نے ملنے کی کوشش کی تو وہ حکیم کو سب کچھ بتا دے گی۔ اتنا کہہ کر داری غصے میں پاؤں پٹختی اوپر چڑھ گئی اور طوفا شرمندہ سا ہو کر سر پر ہاتھ پھیرتا واپس دکان میں آ کر بیٹھ گیا۔ حکیم دکان کے باہر کھڑا شربتوں والی الماری پر گیلا کپڑا پھیر رہا تھا۔ طوفا مٹی کی انگیٹھی میں انگلی سے کوئلے ہٹانے لگا جو بھسم ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد حکیم گدی پر آ کر بیٹھ گیا۔ سوکھے کپڑے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ملتان کے جاگیردار مریض کے قصے سنانے لگا۔ یہ قصے وہ جب سے آیا تھا سنا رہا تھا۔

''اس کی حالت ایسی تھی کہ ولایت کے ڈاکٹروں نے بھی جواب دے دیا تھا۔ انگریزی دوائیں کھا کھا کر اس کی انتڑیاں خشکی سے اکڑ گئی تھیں معدے کی گرمی انتہا کو پہنچ گئی تھی اور تبخیر معدہ کی شکایت بھی شروع ہو گئی تھی۔ شکر تو اس کو اتنی آتی تھی کہ ٹانگیں سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھیں۔ صرف دو روز اسے دوائی کھلائی اور شکر پہلے سے آدھی رہ گئی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ میری بڑی خاطر داری کی۔ اس سال موسم بہار میں اس نے مجھے شکار کی دعوت دی ہے۔ اکٹھے چلیں گے۔ لیکن بہار سے پہلے ذرا اسے پوری طرح شکار کر لوں۔''

طوفا بجھی ہوئی انگیٹھی کے پاس چپ چاپ بیٹھا حکیم کی مبالغہ آمیز داستان سنتا رہا۔ داری کی طرف سے اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا وہاں اسے اس بات کا افسوس بھی تھا کہ داری سے اب وہ راتوں کی ملاقاتیں جاری نہ رکھ سکے گا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ داری اب اسے کبھی نہیں ملے گی۔

حکیم ملتان سے کوئی تین سو روپے لایا تھا۔ ڈیڑھ سو روپے تو اس نے اپنے بچوں کے لئے چھپا کر رکھ لئے اور ڈیڑھ سو داری کو دے

دیئے جن میں سے سو روپیہ اس نے دکان میں نئی دوائیں ڈالنے کے لئے لے لیا۔ داری کے پاس کل پچاس روپے رہ گئے۔ لیکن داری کو حکیم کے روپوں کا لالچ نہ تھا۔ وہ حکیم کے ساتھ اب زندگی بسر نہیں کر سکتی تھی۔ حکیم بوڑھا تھا اور داری بالکل جوان تھی۔ داری کو اس کی سہیلیوں نے بتا رکھا تھا کہ اگر بڈھا مرد جوان لڑکی سے بیاہ کرلے تو جوان ہو جاتا ہے لیکن لڑکی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب سے داری حکیم کے گھر آئی تھی ناخوش تھی۔ کوئی گائے قسم کی لڑکی ہوتی تو رو دھو کر وہیں پڑ رہتی۔ مگر داری خودسر، بھڑکیلی اور اپنی مرضی کے مطابق چلنے والی لڑکی تھی۔ اس نے اپنے باپ کے حکم پر سر جھکا دیا تھا مگر دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ بڈھے خاوند کے گھر زیادہ دیر تک نہیں رہے گی۔ اس گھر میں آتے ہی جب اسے چھ بچوں کی مصیبت بھی پلے پڑ گئی تو اس کا دم ناک میں آ گیا۔ اس نے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیئے۔ اس اندھیرے میں داری کو روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔ یہ کرن ڈاک خانے کا گنجا کلرک غلام مصطفیٰ عرف طوفا تھا۔ داری نے جھٹ سے اپنی گرفت میں لے لیا۔ لیکن طوفا بزدل ثابت ہوا اور بہت جلد داری کو معلوم ہو گیا کہ طوفا محض اس کے ساتھ عیاشی کرنا چاہتا ہے شادی نہیں۔

داری کے اپنے محلے میں ستاروں کا ایک طرح دار لڑکا تھا جو داری سے کنوارپنے کے زمانے میں ہی محبت کرتا تھا اور اسے گلی میں سے گزرتے دیکھ کر فلمی گیت گایا کرتا تھا۔ داری کو بس یونہی اس لڑکے سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ لیکن جب طوفے سے مایوس ہو گئی تو وہ باپ سے ملنے کا بہانہ بنا کر اپنے گھر گئی اور ستارے کے لونڈے سے ملی۔ اس کا نام گلاب عرف گابا تھا۔ داری کا باپ بازار آٹے کی بوری خریدنے گیا ہوا تھا اور داری گھر میں اکیلی تھی کہ اس نے گابے کو دیکھا۔ گابا گلی میں دکان کے پھٹے پر بیٹھا چادر کی بکل مارے سگریٹ پی رہا تھا۔ داری تنور کے پاس جا کر کواڑ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گابا اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ داری نے اسے اشارے سے اندر بلایا گابا بڑا خوش ہوا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور بے دھڑک داری کے پاس آ گیا۔ داری نے بڑے ناز و انداز کے ساتھ گابے سے باتیں شروع کر دیں اور اسے بتایا کہ وہ اب بھی اسی سے محبت کرتی ہے۔ گابے کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اپنے آپ کو پنجابی فلم کا ہیرو تصور کرنے لگا۔

اب داری ہفتے میں تین چار بار کسی نہ کسی بہانے اپنے باپ کے گھر جا کر گابے ستار سے ملتی۔ گابا داری کے عشق میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ جب اس کی محبت انتہا کو پہنچ گئی تو داری نے شادی کی پیشکش کر دی۔ گابا فوراً تیار ہو گیا۔

''لیکن پہلے حکیم سے طلاق لینی ہوگی؟''

''وہ میں لے لوں گی۔

''اس کا باپ بھی دے گا۔''

داری نے حکیم سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیا۔ حکیم کو اعتراض تھا کہ وہ بار بار اپنے باپ کے ہاں کیوں جاتی ہے۔ حکیم کو بھی کہیں سے بھنک پڑ گئی تھی کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے۔ داری نے کہا۔

''وہ میرے باپ کا گھر ہے میں وہاں ضرور جاؤں گی۔ تم مجھے وہاں جانے سے روکنے والے کون ہو؟''

''لیکن میں یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ تم مجھے رسوا کرتی پھرو۔''

''میرا جو جی چاہے گا کروں گی۔''

''اگر یہ بات ہے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔''

''تم مجھے ہاتھ لگا کر دیکھو میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔''

''خاموش کتیا!''

''بک بک بند کرو۔''

حکیم نے غصے میں آ کر داری کو ایک تھپڑ مار دیا۔ داری نے پاس ہی رکھا ہوا گلاس اٹھا کر حکیم کے سر پر دے مارا۔ اگر نیچے سے طوفا آ کر بیچ بچاؤ نہ کرواتا تو وہاں میدان جنگ کا نقشہ بن جاتا۔ اسی روز داری حکیم کے گھر سے اٹھ کر اپنے باپ کے پاس آ گئی۔ باپ کو رو رو کر اس نے حکیم کے ظلم و ستم کی وہ جھوٹی کہانیاں سنائیں کہ باپ کا دل دہل گیا۔ داری کے اصرار پر اس کے باپ نے حکیم سے طلاق حاصل کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ حکیم نے طلاق دینے سے صاف انکار کر دیا۔ داری نے حکیم کے گھر واپس جانے سے انکار کر دیا۔ غریب باپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

داری نے گابے سنار سے چوری چھپے کی ملاقاتوں کا سلسلہ تیز کر دیا۔ گابا تو داری کی زلف کا پہلے ہی اسیر تھا۔ داری کی طرف سے التفات کی بارش شروع ہوئی تو وہ داری کے نام کی پوجا کرنے لگا۔ جب حکیم کی جانب سے طلاق نہ دینے کا فیصلہ ہوا تو داری نے گابے کو بھاگ چلنے کی پیش کش کی۔ گابے سنار پر نئی جوانی کا جوش چڑھا تھا۔ دل میں تازہ تازہ ولولے اٹھ رہے تھے۔ فوراً تیار ہو گیا۔ داری نے کہا۔

''میرے پاس صرف ساٹھ روپے ہیں۔ ان سے گزارہ نہ ہوگا۔ تمہیں کچھ روپوں کا بھی انتظام کرنا ہوگا۔''

گابے نے اپنی تیل میں چپڑی زلفوں کو جھٹک کر کہا۔

''داروجی! فکر نہ کرو۔ گھر میں جس قدر سونا پڑا ہے ساتھ لے لوں گا۔ ہم یہاں سے سیدھے حیدرآباد جائیں گے وہاں میرا ایک دوست ہے اس کے پاس جا کر ٹھہریں گے۔ سونا فروخت کر دیں گے اور مزے سے شادی کر کے عیش کریں گے۔''

''بس یہ ٹھیک۔ پھر کل تم تیار رہنا۔ میں صبح ٹھیک دس بجے بسوں کے اڈے پر پہنچ جاؤں گی۔''

''میری جان میں اونچے پل پر کھڑا ہو کر تمہاری راہ دیکھوں گا۔ لیکن دیکھنا اب بانہہ پکڑ کر چھوڑ نہ دینا داروجی!''

داری نے مسکرا کر کہا۔

''وہ تم نے سنا نہیں۔ جیدی بانا نہہ پھڑیئے۔

اوہدے نال مریئے۔

میں تو ایک دفعہ بانہہ پکڑوں گی تو پھر ساتھ ہی مروں گی۔''

اگلے روز داری نے اپنے کپڑوں کی ایک گٹھڑی سی بنائی اور ماسی خیراں سے ملنے کا بہانہ بنا کر گھر سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ اونچے پل پر گاما سنار بوسکی کی قمیض، سفید شلوار اور پاؤں میں پشاوری چپل پہنے اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ملتان جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ ان کا پروگرام ملتان جا کر حیدرآباد جانے والی ریل گاڑی پکڑنے کا تھا۔

جب داری شام تک واپس نہ آئی تو باپ کو فکر ہوئی۔ وہ سیدھا ماسی خیراں کے ہاں پہنچا۔ معلوم ہوا کہ داری کئی روز سے وہاں نہیں آئی۔ باپ پریشان ہو گیا۔ رات گزر گئی اور داری گھر واپس نہ آئی۔ دن چڑھ آیا۔ ادھر گامے سنار کے ماں باپ بھی پریشان ہو کر گلی میں نکل آئے۔ محلے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ شام تک سب کو معلوم ہو گیا کہ داری گامے سنار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ غریب باپ اندر جا چھپا۔ حکیم کو اپنی عزت کے لالے پڑ گئے۔ اس نے فوراً محلے کے چار بزرگوں کو ساتھ لیا۔ داری کے باپ کے پاس آیا اور کہا۔

''میاں علی محمد! چونکہ تمہاری بیٹی اور میری بیوی بدچلن نکلی ہے اس لئے میں اسے طلاق دیتا ہوں۔''

وہیں حکیم نے طلاق لکھ دی۔ بزرگوں کے اس پر دستخط کروائے حق مہر کے پچیس روپے ادا کائے اور سلام علیکم کر کے محلے والوں کے ساتھ ہی واپس لوٹ گیا۔ باہر آ کر حکیم محلے کے چودھری سے کہنے لگا۔

''بدکردار عورت کے ساتھ کوئی بھی شریف آدمی نبھاہ نہیں کر سکتا۔ ہماری اسلامی فقہ کا بھی یہی حکم ہے کہ اگر بیوی کی بدکاری ثابت ہو جائے تو اپنی عزت بچانے کے لئے فوراً طلاق دے دو۔''

حکیم کپڑے جھاڑ کر اپنی عزت بچا کر پھر سے دکان پر جا بیٹھا۔ لیکن داری کے باپ کے لئے کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ تھی محلے والے اس پر آوازے کسنے لگے باپ کے لئے کہیں سر چھپانے کو جگہ نہ تھی محلے والے اس پر آوازے کسنے لگے اس کا جینا دو بھر ہو گیا۔ آخر اس نے بھی کپڑوں کی گٹھڑی باندھی اور ایک روز منہ اندھیرے مکان کے دروازے پر تالا لگا کر فیصل آباد کے ایک گاؤں میں اپنے بھائی کے پاس چلا گیا۔ گلاب سنار کے باپ نے اس لئے پولیس میں رپٹ درج نہ کروائی کہ جانے پکڑ دھکڑ میں کیا ہو اور پھر ان کا تو بیٹا ہی تھا بیٹی نہیں تھی۔ خاک اڑا کر اپنے ہی گھر واپس آ جائے گا۔ زیورات کا جو نقصان ہوا تھا اسے کسی نہ کسی طرح اس نے پورا کر دیا تھا۔ محلے میں کچھ روز تک دونوں عاشق معشوق کے فرار کے چرچے رہے۔ پھر آہستہ آہستہ لوگ انہیں بھول کر اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے۔

یاقوت کو کلثوم سے ملے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس دوران میں کلثوم دوسرے تیسرے یاقوت کو خط لکھ کر اپنی خیریت کے بارے میں اطلاع دیتی رہی۔ وہ بہت بیماری ہو گئی تھی۔ ایک ماہ بستر پر پڑی رہی۔ اس کے خط بڑے مختصر اور جذبات عقیدت اور محبت سے بھرے ہوتے تھے۔ یاقوت انہیں دن میں کئی کئی بار پڑھتا۔ اور ہر بار ایک نیا لطف اٹھاتا۔ ادھر گاؤں سے بھابھی کا بھی خط آ چکا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ نجمہ کی اپنے پھوپھی زاد بھائی ایڈوکیٹ اصغر سے شادی ہو گئی ہے اور نجمہ لاہور چلی گئی ہے۔ جس روز یاقوت کو بھابھی کا خط ملا اسی روز اسے کلثوم کا بھی ایک خط موصول ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ روز خواب میں اسے دیکھتی ہے یاقوت دونوں خط سامنے رکھ کر بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر کے سر کرسی سے لگا دیا۔ نجمہ کی اصغر سے شادی ہو گئی تھی۔ وہ نجمہ سے محبت کرتا تھا۔ کبھی اس کی خاطر گاؤں کے کھیتوں میں بیری کے درختوں میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ سیڑھیوں کے اندھیرے میں چھپا اس کے نیچے اترنے کا انتظار کیا کرتا تھا۔ ایک ایک آواز پر اس کا دل دھڑکنے لگا تھا۔ اسے نجمہ کی نسواری چمکیلی آنکھیں' سنہری بال اور رخسار کا سیاہ تل یاد آیا۔ وہ دلہن بنی کتنی خوبصورت لگ رہی ہو گی۔ اس نے سرخ رنگ کا گوٹے والا جوڑا پہن رکھا ہو گا۔ اس کے سنہری جسم سے حنا کے عطر کی خوشبوئیں اٹھ رہی ہوں گی۔ اس کے ماتھے پر سونے کا جھومر چاند بن کر چمک رہا ہو گا۔ کیا اس وقت نجمہ نے اسے یاد کیا ہو گا!"

پھر اس کی برات آئی ہو گی۔ ڈھول باجوں کا شور اٹھا ہو گا۔ براتی بسوں میں سے اتر کر مکان کے دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے ہوں گے۔ نجمہ دلہن کا دھڑکنے لگا ہو گا۔ کیا اس وقت اس نے یاقوت کو یاد کیا ہو گا۔ کیا نجمہ کے دل میں اس وقت یہ خیال گزرا ہو گا کہ کاش یہ برات یاقوت کی ہوتی! اصغر کی بجائے یاقوت کا خیر مقدم کرتے! پھر ڈھولک پر سہیلیوں نے سہاگ کے گیت گائے ہوں

گے۔ٹھپ۔ٹھپ۔ٹھپ۔ٹھپ

میری ڈولی نوں لگڑے کلیرے نی ماں

مینوں وداع کرن میرے ویر نی ماں

جنھاں آپ کھڈایا جھولی نی ماں

آج رکھ لے میری ڈولی نی ماں

میرا بابل دوروں تکدا اے

کچھ آکھ نہ موہنوں سکدا اے

اہدا صبر جند ڈولی نی ماں

اج رکھ لے میری ڈولی نی ماں

(میری ڈولی کو کلیرے لگے ہیں۔دیکھو ماں! مجھے میرے بھائی ہی وداع کر رہے ہیں جنہوں نے مجھے اپنی جھولی میں کھلایا ہے۔ اے ماں! میری ڈولی صرف آج کے روز رکھ لے!

میرا باپ دور سے مجھے روتی ہوئی دیکھ رہا ہے مگر میرے درد کا علاج کرنے سے مجبور ہے۔وہ منہ سے کچھ نہیں بول رہا۔آہ! اس کا صبر دیکھ کر میری روح کانپ رہی ہے۔اے ماں! میری ڈولی صرف آج کے روز رکھ لے)

لیکن ایک بار جب دلہن ڈولی میں بیٹھ جاتی ہے تو پھر اسے دلہا کے گھر جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔نہ ماں' نہ باپ اور نہ بھائی اور نہ محبوب! ماں باپ دکھ کی تصویر بنے آنکھوں میں آنسو رو کے گھر کی خاکی دہلیز پر کھڑے کے کھڑے رہ جاتے ہیں اور دل فگار محبوب کسی دوسرے محلے میں یا کسی ویران باغ کے کنارے کھڑا اپنی محبوبہ کی ڈولی کو دور سے جاتے دیکھتا رہتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ دلہن کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی طرح کھل کر رو بھی نہیں سکتا۔کہیں اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کے موتی دلہن کے گلے میں بدنامی کا ہار نہ بن جائیں۔

نجمہ بھی ڈولی میں سوار ہوئی۔اس کی ڈولی بھی گھر سے باجوں کے شور لٹائے جانے والے سکوں کی جھنکار میں اٹھی ہوگی۔کیا اس وقت نجمہ نے یاقوت کو یاد کیا ہوگا؟

پھر دلہن کی بس لاہور کے ایک محلے میں آ کر رک گئی ہوگی۔ دلہا کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے تیل چوایا گیا ہوگا۔ کالا مرغ سر پر سے اتارا گیا ہوگا۔ دو سفید کبوتر چھوڑے گئے ہوں گے۔ دلہن دھڑکتے دل اور روتی آنکھوں کے ساتھ نئے گھر میں داخل ہو گی۔ نندوں بھاوجوں نے اس کی بلائیں لی ہوں گی۔ دلہا اپنے دوستوں میں قہقہے لگا رہا ہوگا۔ بڑی شان سے عورتوں مردوں میں گھوم پھر رہا ہوگا۔ جس طرح کمانڈر اپنی یونٹ میں گھوم پھر کر چکر لگاتا ہے۔ وہ اس کی زندگی کا مسرور ترین دن ہوگا۔ آنے والی رنگین گھڑیوں کے تصور سے اس کے کانوں میں شہنائیاں بج رہی ہوں گی۔ آنکھوں کے سامنے پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی ہوں گی۔

پھر وہ گھڑی بھی آ گئی ہوگی۔ چاروں طرف رات کی خاموشی طاری ہو گئی ہوگی۔ گلی میں اگلے روز ولیمے کی دعوت کے لئے دیگیں چڑھی ہوں گی۔ گوشت کاٹا جا رہا ہوگا۔ مسالہ گھوٹا جا رہا ہوگا۔ زعفران و بادیان خطائی کی خوشبوئیں اڑ رہی ہوں گی۔ اور جوان لڑکیوں نے چھیڑتے، چہلیں کرتے، ہنستے، مسکراتے، دلہن کو حجلہ عروسی میں دھکیل دیا ہوگا۔ اکیلا، تنہا پھولوں اور عطروں کی خوشبوؤں سے مہکتا ہوا کمرہ! پھولوں کی چادر سے ڈھکا ہوا بیش قیمت پلنگ تپائی پر رکھا ہوا دودھ کا جگ اور مٹھائی سے بھری پلیٹ! دلہن سمٹ سمٹا کر پلنگ کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گئی ہوگی۔ پھر دروازہ آہستہ سے کھلا ہوگا۔ کسی کے قدموں کی بھاری چاپ پلنگ کی طرف بڑھی ہوگی۔ دلہن کا دل سینے میں طلائی ہاروں کے پیچھے، گوٹہ لگے سہاگ کے جوڑے کے نیچے دھک دھک دھڑکنے لگا ہوگا! اس سے اظہار محبت کیا ہوگا۔ اسے شادی کے مقدس رشتے کی یاد دلائی ہوگی۔ اسے مستقبل کے سبز باغ دکھلائے ہوں گے اور پھر قریب آ کر، بہت قریب آ کر دلہن کا ہاتھ پکڑ لیا ہوگا اور دوسرے ہاتھ سے نجمہ کا چہرہ نسواری آنکھوں، سنہرے بالوں اور کالے تل والا دلہنی چہرہ آنسوؤں میں بھیگا، سونے کے ذروں سے چمکتا، حنا کے عطر میں بسا ہوا اور گیندے گلاب کے سہروں میں سجا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا ہوگا۔ کیا اس وقت نجمہ نے یاقوت کو یاد کیا ہوگا؟ اور پھر رات بھیگ گئی ہوگی۔ دلہا دلہن کے قریب آ چکا ہوگا۔ دلہن کے زیورات سنگار میز پر پڑے ہوں گے۔ ہار پلنگ کی پٹی سے لٹک رہے ہوں گے اور سہاگ کا جوڑا۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا اس وقت نجمہ نے۔۔۔۔۔۔۔؟

یاقوت نے سر جھٹکا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کا ذہن لاوے کی طرح کھولنے لگا۔ وہ کرسی سے اٹھا۔ سگریٹ سلگایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے سوچا کاش دنیا میں صرف ایک ہی عورت ہوتی۔ صرف ایک دلہن ہوتی۔ صرف ایک بار ڈولی اٹھتی اور اس ڈولی میں بیٹھی ہوئی دنیا کی واحد عورت کا دلہا یاقوت ہوتا۔ دنیا میں ایک بار حجلہ عروسی سجایا جاتا اور اس میں صرف یاقوت داخل ہوتا! اور کوئی نہ داخل ہو سکتا۔ کوئی نہ داخل ہو سکتا۔

اس خط کے ملنے پر یاقوت کچھ روز بڑا پریشان رہا۔ اس خیال سے اور بھی دکھ ہوتا کہ لاہور کی جس فضا میں وہ سانس لے رہا ہے

اسی فضا میں نجمہ بھی اپنے خاوند کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔ جس دھوپ میں وہ چل رہا ہے کیا خبر ابھی ابھی وہاں سے نجمہ بھی اپنے خاوند کے ساتھ گزری ہو! اور کیا جانے بازار کے کسی موڑ پر کسی چوراہے' کسی ہوٹل' کسی سینما گھر کی لابی میں اچانک ان کی ملاقات ہو جائے۔ آمنا سامنا ہو جائے اور وہ نجمہ کو زرق برق لباس میں اپنے خاوند کے ساتھ ساتھ سینما کی سیڑھیاں چڑھتی دیکھے شاپنگ کرتی اور ہوٹل کی گیلری میں بیٹھی چائے پیتی دیکھ لے!

لیکن کچھ روز گزر جانے پر یاقوت کے اس قسم کے خیالات کی شدت کم ہوتی گئی اس میں وقت کے علاوہ کلثوم کے محبت بھرے پیارے گارڈینیا کے عطر میں ڈوبے ہوئے خوشبودار محبت ناموں کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ نجمہ کے لگائے ہوئے گہرے گھاؤ کو مندمل کرنے میں کلثوم بڑی مددگار ثابت ہو رہی تھی۔ پورا ایک مہینہ گزر جانے پر کلثوم نے لکھا کہ اب وہ کالج جانے لگی ہے۔ لیکن ابھی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ یاقوت اسے ملنے کو بیتاب تھا۔ کلثوم نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو چھٹی کے وقت کالج کے باہر کھڑے ہو کر اس سے مل سکتا تھا۔ لیکن یاقوت کی شخصیت کا مجموعی مزاج عام لوگوں سے مختلف تھا۔ اس نے چاندی کی طشتری میں رکھ کر پیش کی گئی شخصیت میں ورڈز ورتھ کی نیچر پرستی' لاکر ہیٹس کی نیچر' غالب کی مشکل پسندی' مومن کی لذتیت' کبیر کی بے نیازی اور میرا بائی کا بیراگ بھی شامل تھا وہ خود شاعر تھا۔ لیکن دوسرے شاعروں سے مختلف۔ اس نے ردیف قافیہ کے سکہ بند تان توڑوں کو چھوڑ کر نثر کی دیوداسی کو ناچ کے نرت بھاؤ توڑے اور کتھا کلی کے انداز سکھائے تھے۔ اس نے سنگلاخ چٹانوں پر کدال چلا کر ان میں سے پھول تلاش کئے تھے۔ پتھروں کا سینہ توڑ کر ہیرے موتی نکالے تھے۔ پانی میں آگ لگائی تھی اور ہوا کی لہروں پر اپنا نام لکھا تھا۔ اور ہتھیلی پر سرسوں جمائی تھی۔ نجمہ کے مقابلے میں کلثوم سے اس کی محبت بھی بالکل مختلف ڈھنگ کی تھی۔ اسے کلثوم سے ایک پل کے ہزارویں حصے میں محبت ہو گئی تھی۔ زندگی اپنے حادثات اور واقعات کا انسان پر گہرا اثر چھوڑ جاتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی حافظے کی لوح پر کچھ ایسی لکیریں بھی ڈال دیتی ہے جن کا بظاہر ہماری زندگی کے کسی حادثے' کسی واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کسی ہجوم میں دیکھا ہوا چہرہ' کسی گلی کے موڑ پر سنی ہوئی آواز' کسی منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا' کسی سڑک کو بھاگ کر عبور کرتا ہوا بچہ اور کبھی ایک بار ہاتھ ملا کر پھر کبھی نہ ملا ہوا آدمی ہمیں ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ اس کی یاد کے نقوش ہمارے حافظے کی لوح پر زندگی بھر کے لئے ثبت ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی کے کسی حادثے کی تفصیلات کو بھول جاتے ہیں لیکن اس ایک بار ملے ہوئے آدمی کے نقوش اپنی مکمل جزئیات کے ساتھ ہمیں ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ یہی پہلی نظر کا تعلق ہوتا ہے۔ کلثوم کی گھبرائی ہوئی چال' گلابی شفاف ایڑیاں اور کالے نقاب کی اوٹ میں سے نظر آنے والا گال اور جھولا ہوا آویزہ ایک نظر دیکھ کر یاقوت کے حافظے پر اسی قسم کی لکیریں ابھری تھیں۔ اگر وہ لاہور ہوٹل کے

چوک میں پنواڑی کی دکان پر کھڑا رہتا تو اسے کلثوم سے محبت تو نہ ہوتی لیکن وہ اس کی گلابی ایڑیوں' جھولتے آویزے' رخسار کی پر اسرار جھلک اور گھبرائی ہوئی چال کو زندگی کے آخری لمحوں تک نہ بھول سکتا۔ لیکن وہ جم کر کھڑا نہ رہا بلکہ اس کے قدم خود بخود کلثوم کے تعاقب میں اٹھ گئے تھے اور اس نے کلثوم کو شیزان کی گیلری میں سامنے بیٹھا کر جی بھر کر دیکھا تھا۔ اس سے باتیں کی تھیں۔ اس کی گھنٹی ایسی آواز سنی تھی اور اس کے سفید کنول کی کھلی ہوئی پتیوں ایسے نازک ہاتھ دیکھے تھے اور اس کی بڑی بڑی حجاب آلود پلکوں کو بار بار اس آنکھوں پر گرتے اٹھتے دیکھ لیا تھا اور اسے کلثوم سے محبت ہو گئی تھی۔ پہلی لکیر کو دوسری گہری لکیر نے دبا دیا تھا۔ پہلی لکیر کبھی نہ مٹنے والی تھی۔ دوسری لکیر مٹ مٹا کر ایک بھولی بسری یاد میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ یاقوت کو معلوم تھا کہ اگر کلثوم اس سے جدا ہو گئی تو اس کے اداس چہرے اس کی آواز اور اس کے ہونٹوں کی شہد بھری مہک کو تو ضرور یاد رکھے گا لیکن اس کے سفید رخسار کی پہلے روز والی جھلکی اور گھبرائی ہوئی چال کو بھول جائے گا۔ اور یاقوت کلثوم کے پہلی ملاقات کے چہرے کو گھبراہٹ میں لاہور ہوٹل کا چوک عبور کرنے اور سیاہ نقاب کی جالی میں سے چمکتی آنکھوں سے یاقوت کو دیکھنے کے انداز کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ شاید محبت کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ جس لڑکی کو ہم ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اسے ایک نظر دیکھ کر پھر کبھی نہیں ملتے۔ جس سے مل کر تعلقات بڑھاتے ہیں اس کی پہلی جھلک کو بھول جاتے ہیں اور جس کی محبت میں ناکام رہتے ہیں اس کی کچھ باتیں یاد رہ جاتی ہیں اور جس سے شادی کر لیتے ہیں اس کی ایک بات بھی یاد نہیں رہتی۔ سب کچھ فراموش ہو جاتا ہے۔ ہر شے بھول جاتی ہے۔

ماتا پتا سب کٹم قبیلہ

ٹوٹ گیا جوں تا گا رے

ایسی پریت لگی موہن سوں

جوں سونے پہ سہاگا رے

لیکن پھر موہن سوں پریت بڑی مشکل سے لگتی ہے۔ پھر سونے پر سہاگا نہیں پھرتا۔ سونے کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ دل کا تجسس ذہن کا تحیر' آنکھ کی حیرت اور روح کی کلپنا جاتی رہتی ہے۔ اگر میرا بائی کا کرشن سے بیاہ ہو جاتا تو اس کے آدھے بھجن شادی کی پالکی میں میرا بائی کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتے۔ یہ یاقوت کا خیال تھا اور اسی لئے کبھی کبھی وہ ڈرتا تھا کہ شادی کے بعد کلثوم ایک محبوبہ کی حیثیت سے ختم ہو کر محض ایک بیوی بن کر نہ رہ جائے۔ کہیں وہ اس کی پیاری پیاری اور خوبصورت باتوں کو بیکار نہ سمجھنے لگے۔ اس سے بور نہ ہو جائے۔ اسکی روز اول کی قیمتی اور پر اسراریاوں کو بھلا نہ بیٹھے۔

اٹھارہ انیس برس پہلے اس نے اپنے مدراس کے قیام کے دوران میں ایک اینگلو انڈین لڑکی کو محض ایک بار دیکھا تھا اور اس کی یاد ابھی تک یاقوت کے ذہن میں ایک تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح تازہ تھی۔ اس لڑکی کو یاقوت نے اپنے فلیٹ کی چکردار سیڑیوں میں دیکھا تھا۔ یاقوت اوپر اپنی کھولی کو جا رہا تھا اور وہ لڑکی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ سیڑھیوں کے خم پر وہ ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا تا کہ لڑکی آسانی سے نیچے اتر سکے۔ لڑکی نیچے اتر کر سڑک پر نکل گئی اور یاقوت کے دماغ میں اپنی یاد کی کبھی نہ مٹنے والی' ہمیشہ تر و تازہ رہنے والی ایک گہری لکیر ڈال گئی۔ اس کے بعد یاقوت نے اس لڑکی کو پھر کبھی نہیں دیکھا۔ اٹھارہ انیس برس گزر جانے پر بھی اسے یاد تھا کہ اس لڑکی کے بال سنہری تھے۔ جسم بھی سنہری تھا۔ اس کی انگلی میں سبز نگینے کی انگوٹھی تھی اور جب وہ اپنا پاؤں سیڑھی کے تختے پر رکھتی تھی تو اس کی سنہری پنڈلی کی مچھلیاں تن جاتی تھیں۔ لڑکی نے گزرتے ہوئے محض اتفاق سے یاقوت کو ایک نظر دیکھا تھا اور یہ دو آنکھیں ابھی تک یاقوت کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ لمحہ' وہ گھڑی وقت کے سرد خانے میں ایک دم منجمد ہو کر زندگی بھر کے لئے زندگی کے بعد کے لئے بھی محفوظ ہو گئی تھی۔ شاید وہی دو چمکتی ہوئی آنکھیں جنہوں نے ایک سکینڈ کے لئے سیڑھی میں سے اترتے ہوئے یاقوت کو دیکھا تھا اسے لاشعوری طور پر اپنا دیوانہ بنائے پھر رہی تھیں اور وہ انہی شفاف آنکھوں کی پر اسرار اشاریت کی تلاش میں کبھی نجمہ کی آنکھوں کو چوم رہا تھا اور کبھی کلثوم کی لمبی پلکوں پر اپنے ٹھنڈے لب رکھ رہا تھا۔ اور وہ آنکھیں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا مسکرا کر اپنا مکھ پھیر رہی تھیں مالکونس کے بول ایک بار پھر اس کے ذہن میں گونجنے لگے۔

کیسی رسیلی نار

کر سولہ سنگار

مکھ موڑ مسکات جات

اور پھر اسے آرزو لکھنوی کی آواز ہرے بھرے جنگلوں سے ابھرتی سنائی دی۔

ہرے بھرے اس بن میں کوئی

گیت سہانے گاتا ہے

پریم سندیسہ دے کر اس نگری کا

حال سناتا ہے

روپ رنگ کی گھیا جس میں!

نسدن پھاگن رہتا ہے

سنو! مدھر تانوں میں کوئی

اپنے پاس بلاتا ہے

تجھ کو ساجن سانجھ سویرے

اپنا روپ دکھاتا ہے

جنوبی ہند کے ہرے بھرے جنگلوں کی آوازیں یاقوت کا تعاقب کر رہی تھیں دو نسواری آنکھیں اپنی لمبی پلکیں پھیلائے اس کے ساتھ ساتھ اڑتی چلی جا رہی تھیں۔ یہ آنکھیں اسے ایک ایسی نگری کا پریم سندیسہ دے رہی تھیں جہاں راتوں کو سورج طلوع ہوتے تھے اور دن کو نیلے آسمان پر زرد چاند گردش کرتے تھے اور گلاب کے سرخ گیندے کے زرد اور چنبیلی کے سپید پھول اپنی پنکھڑیاں پھڑ پھڑاتے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چہچہاتے پھرتے تھے۔ جہاں گل مہر کے شہد ٹپکاتے شگوفوں اور کیلے کے پتوں پر لیٹی کنوری سندریوں کے رس بھرے میٹھے ہونٹوں پر کالے سیاہ بھنورے منڈلاتے تھے اور جہاں کوئی مدھر تانوں میں اسے صبح و شام اپنے پاس بلاتا تھا۔ یہ جنم جنم کا بلاوا تھا۔ یگ یگ کی جستجو تھی۔ کبھی یہ بلاوا نجمہ کے لباس کی سرسراہٹ اور آواز کی سرگوشی بن کر یاقوت کے کانوں پر جھک کر اپنا منتر پھونکتا اور کبھی کلثوم کے روپ میں وحشی ہرن کی طرح گھبرا کر اس کے پاس سے گزر جاتا۔ کبھی بندرابن کی اونچی گھاس میں چھپی ندی اور کبھی لاہور ہوٹل کا چوک عبور کر جاتا اور یاقوت ہر چوک ہر چوراہے پر ار ہر جنگل میں ادھر ادھر تکتا رہ جاتا۔ اس ہرن کی طرح جس کے نافے سے مشک نکل گیا ہو اور جو اس کی تلاش میں خوشبو سونگھتا بھٹکتا پھر رہا ہو۔

پھاگن کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ باغوں میں سویٹ پیز کے پھول کھل گئے تھے۔ جسم کو بھلی لگنے والی انتہائی خوشگوار ہلکی ہلکی گرمی فضا میں پھیل گئی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر سورج بڑی شان کے ساتھ صبح سے شام تک چمکتا۔ دن روشن اور خوشگوار گرم ہو گئے تھے اور نکھرے ہوئے تاروں بھری نیل راتیں چمکدار ہو گئی تھیں۔ ایک روز کلثوم کا خط آیا کہ وہ آج ملنے آئے گی۔ یاقوت ہوٹل میں دن بھر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ کوئی بارہ بجے کے قریب کلثوم نے اپنے مخصوص انداز میں دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ یاقوت نے دستک پہچان لی اور جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

سامنے کلثوم کھڑی تھی۔

یاقوت اسے کوئی دو ماہ کے بعد دیکھ رہا تھا۔ آخری بار جب اس نے کلثوم کو دیکھا تھا تو اس کا رنگ زرد تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ

گئے تھے۔ چہرہ بے حد کمزور ہو گیا تھا اور وہ یاقوت کے سہارے ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی۔ لیکن اس وقت ایک صحت مند' تر و تازہ و شگفتہ ہنستی مسکراتی کلثوم اس کے سامنے کھڑی تھی۔ آنکھوں میں زندگی سے بھرپور شباب کی چمک تھی۔ رنگ پہلے سے زیادہ نکھر کر گورا اور سرخ ہو رہا تھا۔ بالوں میں سویٹ پنیر کے دو لمبے ڈنٹھلوں والے گلابی پھول لگے تھے اور کانوں میں نیلے نگینوں والے بندے چمک رہے تھے۔ کالے نقاب کے چوکھٹے میں اس کا شاداب چہرہ سفید کنول کی تصویر معلوم ہو رہا تھا۔ یاقوت نے اس کا نرم و نازک انگلیوں والا گرم ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے دبایا۔

''خدا کا شکر ہے کہ میں تمہیں ایک بار پھر صحت مند دیکھ رہا ہوں۔''

کلثوم مسکراتی ہوئی اندر کمرے میں آ گئی۔ وہی کمرہ جو ایک لحظہ پہلے' سرد ویران اور تاریک تھا اب گرم' پر بہار اور روشن ہو گیا۔ جیسے کسی نے پردے ہٹا کر کھڑکیاں' کھول دی ہوں اور کمرے کی فضا دھوپ کی گرم روشنی اور سویٹ پنیر کے پھولوں کی خوشبو سے بھر گئی ہو۔ کلثوم کا لباس سفید تھا۔ دوپہر کی دھوپ کی مانند! اس کے کپڑوں میں سے گارڈینیا کے عطر کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جیسے بہار کی صبح کو خوشبو کا سورج طلوع ہو رہا ہو۔ یاقوت نے کلثوم کو اپنے ساتھ لگا کر اپنا چہرہ اس کے بالوں میں چھپا دیا۔ گارڈینیا اور سویٹ پنیر کی ملی جلی تیز مہک نے اسے ایک پل میں اڑا کر باغ عدن کی پھولوں بھری وادیوں میں پہنچا دیا۔

''تم اتنی دیر۔۔۔۔۔۔۔۔۔اتنے دن کہاں رہیں کلثوم؟ تم۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تم ایک ہزار سال بعد مجھے مل رہی ہو۔ کیا تم اسی طرح ہزاروں سال مجھ سے دور رہا کرو گی۔ کیا میری آنکھیں نرگس کی طرح ہزاروں سال تک اپنی بے نوری کو روتی رہیں گی؟''

کلثوم نے مسکرا کر اور کچھ شرما کر کہا۔

''میں پوری طرح صحت مند ہو کر ملنا چاہتی تھی۔''

''لیکن تم نے یہ نہ سوچا کہ کہیں میں پوری طرح بیمار نہ ہو جاؤں؟''

''آپ کے لئے تو میں روز دعا مانگتی تھی۔''

''کونسی دعا؟''

کلثوم چپ ہو گئی۔ یاقوت نے اس کا چاند ایسا مکھڑا اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر پوچھا۔

''کونسی دعا کلثوم؟ تم چپ کیوں ہو گئیں؟''

کلثوم نے لمبی سیاہ پلکیں جھکا کر رک رک کر کہا۔

''میں دعا مانگتی کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کہ خدا آپ کو ہمیشہ صحتمند رکھے۔ آپ کبھی بیمار نہ ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔۔''

کلثوم پھر رک گئی۔ یاقوت نے اس کی چمکتی ہوئی چوڑی پیشانی چوم لی اور کہا۔

''اور کیا کلثوم؟ اور کیا دعا مانگتی تھیں تم؟ کہو کہو رکو نہیں۔''

''اور میں دعا مانگتی کہ میں آپ کو ہمیشہ دیکھتی رہوں۔۔۔۔۔۔۔''

اس کے بعد یاقوت کلثوم سے اور کلثوم یاقوت سے لپٹ گئی۔ کتنی ہی دیر دونوں چپ چاپ ایک دوسرے کے سینے سے لگے رہے اور خاموشی سے ایک دوسرے کے دل کی آواز اور آواز کی سرگوشیاں سنتے رہے۔ اس گھڑی دو گھڑی کی خاموشی میں انہوں نے چپ رہ کر ایک دوسرے کے سینے سے لگ کر اتنی باتیں کر لیں کہ ایک برس تک بھی آمنے سامنے بیٹھ کر نہ کر سکتے تھے۔ دلوں نے دھڑک دھڑک کر ایک دوسرے کو وہ سب کچھ سمجھا دیا جسے کلثوم اور یاقوت دنیا کی کسی زبان میں نہ سمجھا سکتے تھے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب الفاظ بہت پیچھے رہ جاتے ہیں اور قلم بہت آگے نکل جاتا ہے۔ جب کاغذ پر لفظوں کی بجائے محض آڑی ترچھی لکیریں دھبے ہی نظر آتے ہیں۔ ٹہنیاں اور پھول دکھائی دیتے ہیں۔ سرگوشیوں اور گہرے گرم سانسوں کی سرسراہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ لفظوں کے گلدستے ہاتھوں میں پکڑے رہ جاتے ہیں اور مفہوم کی خوشبو آگے نکل جاتی ہے شاخیں دیکھتی رہ جاتی ہیں اور شگوفے گرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہاں قلم ساکت ہوتا ہے کاغذ کا رنگ فق ہوتا ہے اور لفظ کا منہ حیرت سے کھل گیا ہوتا ہے۔ اب اتھاہ سمندروں کی گہرائیاں ماپنے اور چاند کے ساتھ گردش کرنے کی گھڑی ہے۔ خوشبو کی لہر بن کر گھنے جنگلوں اور پرانے قلعوں کی اجڑی ہوئی حرم سراؤں میں آوارہ بھٹکنے کا وقت ہے۔ اے میرے دل! اے میرے ویران محلوں کے شہزادے! اپنے سفید برق رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر ان سحر آلود شہروں کو چل نکل جہاں دروازوں سے لگی سیاہ چشم جادوگر شہزادیاں اشاروں سے اپنے پاس بلاتی ہیں۔

''ٹھک! ٹھک! ٹھک!''

دروازے پر کسی نے دستک دی اور قلعے کی دیوار میں شگاف پڑ گیا۔ خوشبو بھاگ کر پھول میں سمٹ گئی اور جادوگر شہزادیوں نے اپنے دروازے بند کر لئے۔ کلثوم الگ ہو کر اپنے بال درست کرنے لگی۔ یاقوت نے پردہ کھینچ کر دروازہ کھولا۔

باہر ہوٹل کا بیرا طشتری میں تھری کیسل کے دو پیکٹ رکھے کھڑا تھا۔ یاقوت کو اس وقت سگرٹوں کے پیکٹ ناگوار محسوس ہوئے

بہر حال اس نے پیکٹ اٹھالئے اور بیرے کو پٹ دے کر واپس کر دیا۔

’’کون تھا؟‘‘

کلثوم نے قدرے تشویش سے پوچھا۔

’’بیرا سگریٹ لے کر آیا تھا۔‘‘

’’میں تو ڈر گئی تھی کہ خدا جانے کون ہے۔‘‘

یاقوت نے سگریٹ کوٹ کی جیب میں رکھے اور بالوں میں کنگھی پھیر کر بولا۔

’’کلثوم کہیں باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں۔‘‘

کلثوم نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

’’میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ مجھے واپس کالج پہنچنا ہے۔ پورے ایک بجے میرا ایک پیریڈ ہے۔‘‘

’’اور ابھی تو صرف ساڑھے بارہ ہوئے ہیں۔ ہم ایک بجے کھانے سے فارغ ہو جائیں گے۔‘‘

’’جیسے آپ کی مرضی۔‘‘

کلثوم نے برقع پہن لیا۔ ٹیکسی میں سوار ہو کر وہ مال کے مشہور ہوٹل میں آ گئے۔ گیلری میں رش بالکل نہیں تھا۔ صرف ایک بوڑھی عورت اپنی بچی کے ساتھ کونے میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ یاقوت کلثوم کو لے کر دوسرے کونے والی میز پر آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں چھوٹی چھوٹی پیاری پیاری باتیں کرتے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے کے بعد کافی آ گئی۔ یاقوت کافی بنانے لگا۔ گرم گرم تازہ کافی کی مہک کونے والے بڑے گلدان میں لگی یوکلپٹس کی شاخوں کی خوشبو کی خوشبو سے مخلوط ہو گئی۔ یاقوت کو کبھی یوکلپٹس کی خوشبو آتی کبھی کلثوم کے بالوں میں لگے سویٹ پنیر کے پھولوں کی اور کبھی اس کے سپید کپڑوں سے اٹھتی گارڈینیا کے سینٹ کی لپٹ آ جاتی۔ اپنی خوبصورت محبوبہ کے پہلو میں بیٹھ کر شہر کے بہترین ریستوران میں اعلیٰ ترین کھانا کھانے کے بعد گرم کافی اور تھری کیسل کا سگریٹ اور گارڈینیا سینٹ کی خوشگوار مہک ۔۔۔۔۔۔۔ یاقوت کو اچانک پری کا خیال آ گیا۔ اس کے نتھنوں میں چرس کی تیز بو گھسنے لگی اور بوجھل سوجے ہوئے پپوٹوں کے نیچے سے دو لال لال آنکھیں اسے ایک عجیب ویران اداسی سے تکنے لگیں۔ پھر اسے پری کی حسرت بھری آواز سنائی دی۔

’’کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تمہاری زندگی بھی کتنے مزے کی ہے۔ گاؤں سے پیسے آ جاتے ہیں اور اپنا ہوٹل میں بیٹھے عیش کرتے

ہو۔ نہ کوئی فکر ہے نہ فاقہ۔ ایک ہم ہیں کہ رات رات بھر اکڑوں بیٹھے بورڈ بناتے ہیں۔"

پھر اس نے پرسی کو دیکھا کہ گھڑا گود میں ہے۔ سر جھکا ہوا ہے اور خشک ہونٹوں پر بول ہیں۔

شالا چھڈ گیوں کلی

ساڈا ہورای کیہڑا

سانوں لکھ وی نہ دیوے

تیر خالی ویہڑا

کلثوم نے کافی کا چوتھا گھونٹ پیتے ہوئے پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟"

یاقوت نے آنکھیں جھپکا کر کہا۔

"کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔کچھ بھی نہیں۔"

ایک جوڑا گیلری میں آ گیا۔ مرد درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم کا تھا اور سر کے فاختائی سوٹ میں ملبوس تھا۔ لڑکی نے نواری رنگ کا نیا نیا سلا ہوا برقع پہن رکھا تھا اور اس کی بانہوں میں سونے کی چوڑیاں اور انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ دونوں سامنے والی میز پر آ کر بیٹھ گئے۔ لڑکی نے تھوڑا سا نقاب اٹھالیا۔ یاقوت بت بنا اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

نجمہ اپنے خاوند اصغر ایڈووکیٹ کے ساتھ اس ہوٹل میں آئی تھی۔

اصغر نے مال پر اسے تھوڑی سی شاپنگ کروائی اور پھر دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے یہاں لے آیا۔ وہ قصبہ اسلام پوری کی سادہ لوح نجمہ پر اپنی شہری زندگی کا رعب جمانا چاہتا تھا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ یہ لاہور کا بہترین ہوٹل ہے اور یہاں صرف اعلیٰ قسم کے تعلیم یافتہ اور امیر لوگ ہی کھانا کھانے آتے ہیں۔

"یہ ہوٹل گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم رہتا ہے۔ دیکھو ان کے چمچے اور پیالے کتنے اعلیٰ ہیں۔ یہ خاص طور پر لندن سے منگوائے گئے ہیں۔ میں تو شادی سے پہلے صرف اسی ہوٹل میں آ کر بیٹھا کرتا تھا۔ یہاں چائے کی ایک پیالی ایک روپے میں ملتی

ہے۔۔۔۔۔۔۔"

لیکن نجمہ اب کچھ نہیں سن رہی تھی کیونکہ اس نے بھی سامنے والی میز پر یاقوت کو دیکھ لیا تھا۔ ایک اور برقع پوش لڑکی کے ساتھ وہ پہلی بار یاقوت کو کسی غیر لڑکی کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور یاقوت بھی نجمہ کو پہلی بار کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے' اداس ہو گئے تھے۔ نجمہ کے ساتھ بھی ایک فالتو مرد تھا جو اس کا خاوند تھا۔ یاقوت کے ساتھ بھی ایک فالتو لڑکی تھی جو اس کی محبوبہ تھی۔ اگر نجمہ یاقوت سے نہ بچھڑتی تو اسے کلثوم سے کبھی محبت نہ ہوتی اگر نجمہ یاقوت کے ساتھ گھر سے بھاگ کر شادی کر لیتی تو آج اصغر ایڈووکیٹ اس کے ساتھ نہ ہوتا۔ پھر وہاں نہ کلثوم ہوتی اور نہ اصغر۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ صرف نجمہ اور یاقوت ہوتے۔ میاں اور بیوی ہوتے۔ دلہا دلہن ہوتے۔ لیکن اب سوائے ان دونوں کے وہاں سب کچھ تھا۔ صرف وہ نہیں تھے۔ باقی ہر شے موجود تھی۔ وہ دونوں ہوٹل کی گیلری سے نکل کر اسلام پور کے ایک حویلی نما پرانے مکان کی نیم روشن سیڑھیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر کھڑے تھے اور یاقوت کہہ رہا تھا۔

"یہ تمہارے ساتھ کون ہے نجمہ؟"

اور نجمہ سر جھکائے۔ آنکھیں جھکائے خاموش کھڑی تھی اور اس کی بند پلکو سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

"یہ کون ہے نجمہ؟ کیا تم اس کے پلنگ پر سوتی ہو نجمہ؟ نجمہ تمہیں ایک اجنبی آدمی کے پلنگ پر لیٹنے سے حجاب محسوس نہیں ہوتا؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے نجمہ؟ تم کہاں سے چلی تھیں اور کہاں آ گئی ہو نجمہ! بولو نجمہ! نسواری آنکھوں' سنہری بالوں اور کالے تل والی نجمہ۔۔۔۔۔۔۔!"

نجمہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ خاموش تھی۔ اور پھر یاقوت نے سر جھکا رکھا تھا اور نجمہ اس سے کہہ رہی تھی۔

"تم نے اتنی جلدی مجھے فراموش کر دیا یاقوت کہ میرا بیاہ ہوتے ہی دوسری لڑکی کو ساتھ لے کر گھومنے لگے؟ کیا تم میری شادی کا انتظار کر رہے تھے؟ میں تو خیر ماں باپ کی عزتوں میں جکڑی ہوئی بے زبان گائے کی طرح ڈولی میں بیٹھ گئی لیکن تمہیں تو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تم تو کہا کرتے تھے نجمہ میں تمہارے سوا اور کسی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ میں صرف تم سے محبت کرتا ہوں اور ساری زندگی محبت کرتا رہوں گا۔ پھر تم اتنی جلدی ایک لڑکی سے محبت کیسے کرنے لگے یاقوت؟ بتاؤ یہ کالے برقعے والی لڑکی جس کی پیٹھ میری طرف ہے اور جس کے گورے گال کا مجھے ایک حصہ ہی دکھائی دے رہا ہے کون ہے؟ کیا تم واقعی اس لڑکی سے محبت کرتے ہو؟ کیا تم اسے بھی کسی مکان کی سیڑھیوں میں کہا کرتے ہو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟ جس طرح تم مجھ سے پیار کرتے تھے۔ میرے

ہونٹ بھی اسی طرح' اسی محبت اور اسی دیوانگی سے چومتے ہو؟ نہیں نہیں یاقوت! تم ایسا نہیں کر سکتے! تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے اگر میں تمہیں اکیلا یہاں اداس اور پریشان بیٹھا دیکھتی تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا اس لڑکی کے ساتھ خوش وخرم بیٹھا ہوا دیکھ کر ہوا ہے۔ کاش! میں اپنے خاوند کے ساتھ یہاں کھانا کھانے نہ آتی۔۔۔۔۔۔۔کاش! آج میں اپنے گھر ہی سے باہر نہ نکلتی! کاش میں تم سے کبھی محبت نہ کرتی۔۔۔۔۔۔۔"

نجمہ کے ہونٹوں پر مہر لگی تھی۔ یاقوت بت بنا ہوا تھا۔ لیکن دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے سے اسی قسم کے سوالات پوچھ رہی تھیں نجمہ کہہ رہی تھی۔ یہ میرا خاوند ہے میرے باپ نے مجھے اس کے پلے باندھ دیا ہے۔ اب ساری زندگی اسی کے ساتھ رہنا ہے۔ جب تک اسے موت نہیں آتی باقی عمر اسی کے ساتھ بسر کرنی ہے۔ میں مجبور ہوں۔ اسلام پور قصبے کی شریف اور ماں باپ کی عزت پر اپنی محبت' اپنی آن اور اپنی زندگی تک قربان کر دینے والی لڑکی ہوں۔ میں تمہارے ساتھ نہ بیاہی جا سکی۔ اس کا مجھے قلق ہے لیکن میں زندگی بھر صرف تم سے ہی پیار کرتی ہوں گی۔ دنیا تمہیں مجھ سے چھین سکتی ہے لیکن میں زندگی بھر صرف تم سے ہی پیار کرتی رہوں گی۔ دنیا تمہیں مجھ سے چھین سکتی ہے لیکن تمہارا پیار میرے دل سے نہیں نکال سکتی۔ وہ پھول کو ڈالی سے توڑ تو سکتی ہے مگر اس کی کلیوں سے اس کی مسکراہٹ نہیں چھین سکتی۔

اور یاقوت کہہ رہا تھا۔ نجمہ ایسی نہیں ہے۔ یہ محبت کر کے بھول جائے کی بات نہیں ہے۔ یہ زاویہ نگاہ کا فرق ہے۔ جس طرح مرد عورت کے دل کی گہرائیوں کو ماپ نہیں سکتا اسی طرح عورت بھی مرد کی نفسیات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ عورت صرف محبت کرتی ہے اور مرد بہت کچھ کرتا ہے۔ اسے بہت کچھ کرنا ہوتا ہے۔ مجھے تم سے بھی محبت ہے کلثوم سے بھی محبت ہے۔ ہاں! اس کا نام کلثوم ہے۔ یہ بڑی پراسرار لڑکی ہے۔ اس کے ہاتھ تمہارے دل سے بھی زیادہ نازک ہیں اور اس کی آنکھیں میرے دل سے بھی زیادہ گہری ہیں میں س لڑکی سے پیار کرتا ہوں۔ جس طرح تمہیں پیار کرتا ہوں۔ میں نے اس کے ہونٹ کئی بار چومے ہیں جس طرح کبھی تمہارے چوما کرتا تھا۔ ایسا کیوں ہے؟ یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ بڑا عجیب فلسفہ ہے۔ یہ کہانی میں تمہیں پوری طرح سنا بھی نہیں سکتا اور تم سن بھی نہیں سکتیں۔ یہ عجیب فلسفہ میں تمہیں سمجھا بھی نہیں سکتا اور تم سمجھ بھی نہیں سکتیں۔

باتیں کرتے کرتے اچانک نجمہ کے خاوند ایڈووکیٹ محمد اصغر بھٹی کو محسوس ہوا کہ اس کی دلہن بیوی اس کی باتیں نہیں سن رہی بلکہ کسی گہری سوچ میں گم ہے۔ اس کی طرف نہیں بلکہ اس کے کندھوں کے اوپر سے پیچھے کسی کی جانب دیکھ رہی ہے۔

"ادھر کیا دیکھ رہی ہو نجمہ؟"

نجمہ چونک پڑی۔

''جی نہیں۔ کچھ نہیں دیکھ رہی۔۔۔۔۔۔۔۔وہ پیچھے ایک لڑکی بیٹھی ہے اس کے کانوں کے جھمکے دیکھ رہی تھی۔

بڑا خوبصورت ڈیزائن ہے۔''

عورت ہر مرحلے پر جھوٹ بول سکتی ہے۔ نازک سے نازک مقام پر محفوظ رہ سکتی ہے۔ مرد ایسا نہیں کر سکتا۔

''ڈیزائن یاد رکھنا۔ میں کل ہی تمہیں اس قسم کے جھمکے بنوا دوں گا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہاں تو میں تمہیں بتا رہا تھا کہ عدالت نے میرے پیش کردہ گواہ کو رد کر دیا۔ کیس کمزور ہو گیا۔ میں پریشان ہو گیا۔ آخر ایک نقطہ اچانک مجھے سوجھ گیا۔ جس کاغذ پر جائیداد کا وصیت نامہ لکھا گیا تھا وہ کاغذ لندن کا بنا ہوا تھا اور جامد او کوٹ رادھو رام میں تھی اور اس پر تاریخ۔۔۔۔۔۔۔''

اصغر اپنی بیوی کے آگے اپنی قانونی لیاقت کے تعریفی پل باندھ رہا تھا اور سادہ لوح نجمہ کو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور اب جبکہ اس نے یاقوت کو ایک لڑکی کے ساتھ اپنے سامنے دیکھ لیا تھا تو اس پر خود فراموشی کا ایک عجیب عالم طاری تھا۔

کلثوم نے بھی یاقوت کو یک لخت خاموش ہوتے محسوس کر لیا تھا۔ اس نے سوچا شاید وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ مگر جب خاموشی زیادہ لمبی ہو گئی اور یاقوت کی آنکھیں کسی کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتی رہیں تو کلثوم نے ایک بار پھر پوچھا۔

''کیا سوچ رہے ہیں آپ؟''

''کچھ نہیں! کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔''

یاقوت نے چونک کر جواب دیا اور سگریٹ سلگا یا۔

''کوئی بات ضرور ہے۔ آپ پر تھوڑی دیر بعد خود فراموشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا۔ مجھ سے کوئی بات نہ چھپایئے۔ مجھے ضرور بتا دیجئے کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟''

تجربات نے یاقوت پر ایک بات سورج کی طرح واضح کر دی تھی کہ عورت کو اپنے دل کی بات کبھی نہ بتاؤ۔ اور ایسی عورت پر تو اپنے دل کا راز کبھی نہ کھولو جس سے تم محبت کرتے ہو۔ اور پھر وہاں کلثوم کو بتانے والی بات بھی کوئی نہ تھی۔ یاقوت نے ادھر ادھر کی دو ایک باتوں میں کلثوم کو ٹال دیا اور محض اس کی تسلی کے لئے اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ دوسری جانب جب نجمہ نے یاقوت کو اس لڑکی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا دیکھا تو وہ اپنا دل تھام کر رہ گئی۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے اور حلق کڑوا ہو گیا۔ وہ سمجھی کہ یاقوت اسے جلانے کے لئے ایسا کر رہا ہے۔ اسے یاقوت پر بڑا غصہ آیا۔ انتقامی طور پر اس نے بھی اپنے خاوند سے ہنس ہنس کر باتیں

کرنی شروع کردیں وہ ایک دم بڑی زندہ دل اور شگفتہ ہوگئی اور اس کی بات بات سے شوخی اور مسکراہٹ ٹپکنے لگی۔ وہ اپنے ایڈووکیٹ خاوند کے گھٹیا سے گھٹیا لطیفے پر بھی دل کھول کر ہنسنے لگی۔ اس کا خاوند پھولا نہیں سما رہا تھا۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو دنیا کا سب سے زیادہ ہنسانے والا لطیفہ باز آدمی خیال کرر ہا تھا۔ یاقوت سمجھ گیا کہ نجمہ محض اسے جلانے کے لئے ایسا کر رہی ہے کیونکہ وہ کلثوم سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا ہے یاقوت کو نجمہ کی کھوکھلی مسکراہٹوں اور اس کے خاوند کے جھوٹے بھرم پر بڑا ترس آیا۔ جب سے نجمہ اپنے خاوند کے ساتھ گیلری میں آئی تھی وہاں کی فضا میں ایک نمایاں تبدیلی یہ ہوئی تھی کہ یوکپٹس ' کافی ' تھری کیسل اور گارڈینیا کے سینٹ کی مہک کے ساتھ حنا کے عطر کی خوشبو بھی گھل مل گئی تھی۔ وہی عطر جو یاقوت اپنے خطوں میں بسا کر نجمہ کو بھیجا کرتا تھا۔ یاقوت کو اپنے خط یاد آ گئے۔ اور وہ اداس ہو گیا۔ نجمہ نے بھی فضا میں اپنے کپڑوں میں لگے ہوئے حنا کے عطر کے علاوہ ایک اور عطر کی خوشبو محسوس کی۔ بڑی پراسرار اور گہری خوشبو تھی۔ یقیناً یہ نیا عطر یاقوت کے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی نے لگا رکھا ہے نجمہ ایک بار پھر اداس ہو گئی۔ اس کی مصنوعی مسکراہٹ بھاپ بن کر اڑ گئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اداس اور غمگین دیکھا تو دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے پھر محبت اور ہمدردی پیدا ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کو تھوڑی دیر بعد حسرت و یاس کے ساتھ تکنے لگے۔ اب یاقوت نے دیکھا کہ نجمہ پہلے سے زیادہ بنی سنوری اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی نسواری آنکھوں میں کاجل لگا تھا۔ اور ماتھے پر سونے کا جھومر چاند بن کر چمک رہا تھا اور کانوں میں جھمکے جھلملا رہے تھے اور ہونٹوں پر سرخی دمک رہی تھی۔ نجمہ نے دیکھا کہ یاقوت پہلے سے کچھ دبلا پتلا ہو گیا ہے۔ چہرہ کچھ پیلا پڑ گیا ہے اور آنکھیں اداس اداس رہنے لگی ہیں۔ کیا یہ سب اس کے غم میں ہوا ہے؟ نجمہ نے اس بات کے جواب میں کچھ فخر سا محسوس کیا اور پھر وہ دل ہی دل میں یاقوت کی بلائیں لینے لگی۔ پھر اچانک اسے دوسری لڑکی کا خیال آ گیا۔ آخر یہ برقع پوش لڑکی کون ہے؟ یاقوت کی کوئی بہن اور رشتہ دار عورت لاہور میں نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ اجنبی لڑکی ہے۔ اور یاقوت اس میں دلچسپی لیتا ہوگا۔ نجمہ کے ہونٹ ایک بار پھر سکڑ گئے اور زبان کا ذائقہ تلخ ہو گیا وہ کھانا کھا چکے تھے۔ اس کا خاوند کافی کا آرڈر دینے لگا تو نجمہ نے کہا۔

''پھر پی لیں گے۔ میرا یہاں دم گھٹنے لگا ہے۔ اب گھر چلیں۔''

''اچھا پھر پی لیں گے۔ تمہیں ان بند ہوٹلوں میں بیٹھنے کی عادت نہیں ہے نا اس لئے تمہیں گھٹن محسوس ہو رہی ہے۔ مگر یہ تو ایئر کنڈیشنڈ ہوٹل ہے۔ چلو پھر سہی پھر سہی۔ بیرا! بل لاؤ۔''

یاقوت نے اپنے سر کا بوجھ ہلکا ہوتا محسوس کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ نجمہ جتنی جلدی ہو سکے اپنے خاوند کو ساتھ لے کر وہاں سے چلی

جائے۔ وہ اسے اپنے خاوند کے ساتھ اب زیادہ دیر تک باتیں کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نجمہ کی باتوں سے اسے وہ باتیں یاد آ رہی تھیں جو وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر کیا کرتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بیرا بل لے آیا۔ نجمہ کے خاوند نے بل ادا کیا اور نجمہ کو ساتھ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ نجمہ برقعہ درست کرتے ہوئے سیڑھیاں اترنے لگی۔ اس نے آخری بار کنکھیوں سے یاقوت کو دیکھا اور اپنے خاوند کے ساتھ نیچے اتر گئی۔ یاقوت نے سکھ کا گہرا سانس لیا۔ تھری کیسل کا تازہ سگریٹ سلگایا اور کلثوم سے خدا جانے کس موضوع پر باتیں کرتے ہوئے پردے کی جالیوں میں سے نیچے نجمہ کو اپنے خاوند کے ساتھ ہوٹل سے باہر نکلتے دیکھنے لگا۔ جب نجمہ ہوٹل سے باہر نکل گئی تو یاقوت نے سوچا یہ خاوند الو ہوتے ہیں جو دوسروں کی بیویوں کو ساتھ ساتھ لئے پھرتے ہیں اور یہ لڑکیاں کس قدر عجیب ہوتی ہیں جو ایک پل سب کچھ بھول بھلا کر دوسروں کے ساتھ چل پڑتی ہیں۔

''نیچے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟''

یاقوت نے جلدی سے نظریں جالی دار پردوں سے ہٹالیں۔

''کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ یونہی لوگوں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ ہوٹل کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ یہاں لوگوں کا ہر گھڑی تانتا بندھا رہتا ہے ایک آتا ہے۔ دوسرا نکل جاتا ہے۔''

یاقوت کچھ اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگا۔ اس کے ذہن پر ابھی تک نجمہ کی شخصیت کا زبردست اثر تھا۔ وہ اچانک جو اپنے خاوند کے ساتھ اس کے سامنے آ گئی تھی یاقوت نے جلدی سے اپنے جذبات پر قابو پایا اور بڑی محبت سے کلثوم کی گہری گھنی پلکوں والی شفاف آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

''تمہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوئی کلثوم؟''

کلثوم نے ایک دو بار پلکیں جھپکا کر آنکھیں نیچی کر لیں اور کہا۔

''مجھے یوں لگا تھا جیسے۔۔۔۔۔۔۔۔ جیسے آپ اس لڑکی کو دیکھ رہے ہیں؟''

''کس لڑکی کو کلثوم؟''

''وہ جو ابھی ابھی یہاں سے اٹھ کر گئی ہے۔''

جیسے یاقوت کے دل کو کسی نے اپنی مٹھی میں لے لیا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔

''کلثوم! جہاں تک لڑکیوں کو دیکھنے کا تعلق ہے میں صرف اتنا کہوں گا کہ اب ہر لڑکی پر مجھے تمہارا گمان ہوتا ہے اور اگر تم اس ہوٹل

کی بجائے اس وقت میرے کمرے میں ہوتیں تو میں یہی بات تمہیں اپنے سینے سے لگا کر کہتا اور مجھے یقین ہے کہ زبان کے ساتھ ساتھ میرے دل کی گرمی اور سچائی بھی تمہیں اس کا یقین دلا دیتی۔"

یاقوت کی اس قسم کی غیر معمولی باتوں سے کلثوم پر عجیب اثر ہوا کرتا تھا۔ وہ ایک ہی پل میں سب کچھ بھول بھلا کر اس کی دل و جان سے گرویدہ ہو جاتی تھی۔ وہ تو سچ مچ اس چھوٹی چھوٹی مونچھوں' ذہین آنکھوں' پکے ہوئے بالوں اور چوڑے شانوں اور سنجیدہ پیشانی والے آدمی سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس نے کلثوم کا اس نازک وقت میں ہاتھ تھاما تھا جب ہو کر ئی اسے چھوڑ کر چل دیا تھا۔ جب اس کی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کے ماں باپ اور خاندان کی عزت بھی ذلت کے غار میں لڑھکتی جا رہی تھی۔ وہ کلثوم کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے ساتھ لگا کر آندھیوں کے طوفان میں اس کے لئے چٹان بن کر کھڑا ہو گیا تھا اور اس نے ہر باد مخالف کا مقابلہ کیا تھا۔ پھر کلثوم کو اس سے پیار کیوں نہ ہوتا۔ مگر کلثوم نے اپنی طرف سے کبھی زیادہ جوش وخروش کا اظہار نہ کیا تھا۔ کیونکہ ابھی اسے پوری طرح سے یقین نہیں تھا کہ اس کے گھر والے یاقوت سے اس کی شادی کر دیں گے یا نہیں؟ اس ترازو میں نجمہ اور کلثوم دونوں برابر تھیں۔ جس طبقے سے یہ دونوں لڑکیاں تعلق رکھتی تھیں وہاں عموماً یہ ہوتا ہے کہ یا تو لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے بھاگ جاتی ہے یا نجمہ کی طرح ماں باپ کی مرضی کے مطابق شادی کر دی جاتی ہے اور جہیز میں اپنے عاشق کی یاد بھی خاوند کے گھر لے جاتی ہے۔ کچھ عرصے تک یہ رومانٹک سی یاد اس کے سینے سے لگی رہتی ہے اور جب اس جگہ سینے سے ایک بچہ لگ جاتا ہے تو وہ سب کچھ بھول بھلا کر تن من سے اپنے بچوں کی پرورش اپنے خاوند کی خدمت اور اپنے گھر کی دیکھ بھال محو ہو جاتی ہے۔ اس وقت اگر پرانا عاشق اس کی زندگی میں دوبارا داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ اسے ہرگز ہرگز ایسا کرنے نہیں دیتی۔ پھر وہ اسے محض ایک بھولے بسرے دلچسپ خواب کی مانند یاد رکھتی ہے جو کچھ کچھ یاد رہا ہو بہت سا بھول گیا ہو ایسی لڑکیاں اپنی محبت کے شدید جذبات' پیار کی کھلی باتیں' جسم کی گہری لذتوں کی امنگیں اور شعلوں کی طرح بھڑکتی آرزوئیں شادی کے دن کے لئے بچا بچا کر رکھتی ہیں۔ ان بچوں کی طرح جو عید کے میلے کے لئے اپنی بُغچی میں پیسے جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص ان لڑکیوں سے بُغچی توڑ کر بچا بچا کر رکھا ہوا مال زبردستی چھین کر لے جائے تو یہ اسے کبھی معاف نہیں کرتیں اور انہیں اس نقصان کا صدمہ کبھی نہیں بھولتا۔ کلثوم بھی انہی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ بھی یاقوت سے شادی کر کے اپنے محبت بھرے جذبات کا بند توڑنا چاہتی تھی۔ پہلے گویا اسکی زبان پر تالا پڑا تھا۔ اگرچہ اس کا بھی تھوڑا بہت مال لوٹ لیا گیا تھا۔ شہاب کی مکاری اور چالاکی کی وجہ سے کلثوم کی نادانی اور ناسمجھی کی وجہ سے اندھے جذبات کی رو میں بہہ نکلنے کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔ مگر کلثوم کو اس نقصان عظیم کی ایک تفصیل یاد تھی اور نے اپنے لوٹنے والے کو ایک پل کے لئے بھی

معاف نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ شہاب نے عمر بھر کے لئے اسے داغ دار کر دیا ہے۔ اس سے وہ چیز چھین کر ضائع کر دی ہے جسے وہ دوبارا حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے یاقوت مل گیا۔ جس نے نہ صرف اسے ڈوبتے میں سہارا دیا بلکہ اسے احساس تک نہ ہونے دیا کہ وہ ایک خالی خولی سیپ ہے جس میں سے موتی غائب ہو چکا ہے اور اب اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ یاقوت نے اپنی محبت کے سارے پھول کلثوم کی جھولی میں ڈال دیئے اور اس کی پوجا کرنے لگا۔ کلثوم یہ ساری باتیں جانتی تھی۔ مگر اس کے دل میں خوف کا ایک احساس ہر وقت رہتا تھا۔ اسے ڈر لگا رہتا کہ اگر اس کے ماں باپ نے کسی وجہ سے یاقوت کے ساتھ اس کی شادی کرنے سے انکار کر دیا اور اسے کسی دوسری جگہ بیاہ دیا تو اس کی زندگی کا کیا ہوگا؟ وہ حجلہ عروسی میں اپنے خاوند کے پاس کیا منہ لے کر جائے گی؟ کیا وہ یہ جان کر کہ اس کی دلہن کا گوہر عصمت لٹ چکا ہے اسے قبول کرے گا؟ کیا جوہری موتی کے بدلے خالی سیپ خریدنا گوارا کرے گا؟ اسی خوف کے احساسکے ساتھ وہ کبھی کبھی یاقوت کی محبت بھری ہم آغوشیوں کے بیچ بھی غمگین ہو جاتی اور اس کا محدود ذہن عجیب عجیب قسم کی ڈرا دینے والی سوچوں میں بھٹکنے لگتا۔ اس وقت بھی ہوٹل کی گیلری میں بیٹھے بیٹھے جب یاقوت نے اپنی گرم گرم نگاہوں اور مسکراتے ہونٹوں سے اس کی طرف دیکھ کر بھرپور محبت کا اظہار کیا تھا تو وہ اداس ہو گئی تھی۔ یاقوت نے اس کی اداسی کو دیکھ کر پوچھا۔

''کیا اب بھی تمہیں میری محبت کا یقین نہیں آیا کلثوم؟ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں کسی اور سے بھی محبت کر سکتا ہوں؟ شاید میں ایسا کر سکتا کلثوم؟ لیکن جب تک تم میرے ساتھ ہو۔ جب تک تمہاری محبت میرے ساتھ ہے میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ کبھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تم سے شادی کروں گا۔ تمہیں دلہن بنا کر اپنے گھر لاؤں گا۔ کیونکہ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر تم سدا میرے پاس رہ سکتی ہو۔''

کلثوم نے شادی کے نام پر شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اسے یقین تھا کہ یاقوت سچ بول رہا ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ لیکن کیا کلثوم کے گھر والے راضی ہوں جائیں گے؟ اسکے بھائی' برادری کے باہر کا رشتہ قبول کر لیں گے؟ اس خیال سے اس کا دل سوگوار ہو گیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اگر اس کے گھر والوں نے رشتہ قبول کر لیا۔ اس کی یاقوت سے شادی ہو گئی تو کیا شادی کے بعد زندگی کے کسی مرحلے کسی مقام پر جا کر وہ سے بے عصمت ہونے کا طعنہ تو نہیں دے گا؟ وہ یاقوت کو بہت زیادہ نہیں جانتی تھی اور اگر جانتی بھی ہوتی ان کی محبت کو چند مہینوں کی بجائے کئی سال بھی گزر گئے ہوتے تو اس کا یہ خدشہ اپنی جگہ پر درست تھا۔ اس نے اپنے رشتہ داروں میں گلی محلوں میں میاں بیوی کی لڑائیاں ہوتے دیکھی تھیں۔ ان کے طعنے مہنے سنے تھے۔ وہ اس وقت سے بے حد ڈر رہی

تھی جب یاقوت کے دل میں یہ احساس جنم لے لے کہ اس کی بیوی شادی کے سمے کنوری نہیں تھی اور اس نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے جو شادی سے پہلے ایک بچہ ضائع کروا چکی ہے۔ کلثوم تو اس کے دعوے کو جھٹلا بھی نہ سکے گی۔ کیونکہ یاقوت تو اس کے ضائع شدہ بچے کا چشم دید گواہ تھا۔

''تم اداس کیوں ہو گئیں کلثوم! کیا تم مجھ سے بیاہ نہیں کرنا چاہتیں؟ کیا تم میرے علاوہ۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔۔۔۔تم کسی اور سے پیار کرتی ہو؟''

کلثوم نے ایک سسکی سی بھر کر ایک دم پلکیں اٹھائیں اور یاقوت کو بڑے پیار بڑے درد اور بڑی اداسی کے ساتھ دیکھا۔

''ایسا تو نہ کہیئے۔ مجھے اس طرح کا الزام تو نہ دیجئے۔''

یاقوت نے جلدی سے کہا۔

''میں معافی چاہتا ہوں کلثوم! معافی چاہتا ہوں۔''

کلثوم کے بالوں میں لگے سویٹ پنیر کے دونوں پھولوں کی نازک پنکھڑیاں مرجھا کر اس کے بالوں کے ساتھ لگ کر جیسے سو گئی تھیں۔ اس کے لباس سے اٹھنے والی گارڈینیا سینٹ کی مہک بھی یاقوت کو اب کم محسوس ہو رہی تھی۔ یاقوت نے نیا سگریٹ سلگایا اور پیالی میں پڑی ٹھنڈی کافی کا ایک گھونٹ پی کر بولا۔

''لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تمہارے دل میں کسی بات کا غم ہے جسے تم مجھ پر ظاہر نہیں کر رہی ہو جو تمہارے چہرے اور آنکھوں میں صاف عیاں ہے۔''

کلثوم ایک لمحہ خاموش رہی۔ کچھ سوچتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی۔

''مجھے صرف ایک بات کا ڈر ہے۔ ایک شے کا وہم ہے۔''

''کس بات کا؟ بتاؤ نا؟''

''شادی کے بعد کہیں آپ یہ تو نہیں سوچنے لگیں گے کہ آپ نے ایک غلط لڑکی سے بیاہ کر لیا ہے؟''

یاقوت نے میز پر ہاتھ پھیلا کر کلثوم کا نازک ہاتھ پکڑ کر دبایا اور بڑے اعتماد سے بولا۔

''جو لوگ ایسا کرتے ہیں میں انہیں مرد نہیں سمجھتا۔ ایک مرد جب کسی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر اسے طوفان سے نکالتا ہے تو کنارے پر آ کر بھی نہیں کہتا کہ اس لڑکی کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ وہ کبھی اس کی کمزوری کا مذاق نہیں اڑاتا اس کی کسی خامی کا سے طعنہ نہیں دیتا۔ اور پھر تم

سے جو کچھ بھی ہوا تمہاری نادانی اور ناسمجھی میں ہوا۔ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ اگر تمہیں کسی نے بتا دیا ہوتا کہ اس ذرا سی غلطی کے بعد تمہیں کتنا بڑا خمیازہ بھگتنا پڑے گا تو میرا خیال ہے کہ تم چھت سے کود کر خودکشی کرلیتیں مگر وہ غلطی نہ کرتیں۔ اس لئے آئندہ میرے سامنے ایسی بات کبھی نہ کرنا۔ اور نہ کبھی اس قسم کی فضول باتوں پر غمگین ہو کر اپنے دماغ کو پریشان کرنا۔ کیا اب بھی تمہارا وہم دور نہیں ہوا؟"

کلثوم کو یوں محسوس ہوا جیسے بادل چھٹ گئے ہوں اور گہرے نیلے آسمان پر سورج چمکنے لگا ہو اور سفید بے داغ' بے فکر شاداں اور فرحاں خیالات کے کبوتر دھوپ میں چکر لگا رہے ہوں۔ اس کے بالوں کے سویٹ پنیر پھولوں میں جان سی پڑ گئی۔ ان کی مرجھائی ہوئی پنکھڑیاں دوبارہ جی اٹھیں اور اس کے سپید لباس میں سے ایک بار پھر گارڈینیا کے سینٹ کی مہک اڑنا شروع ہوگئی۔ اس کا چہرہ کھل گیا اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ یاقوت نے خوش ہو کر کہا۔

"بس اسی طرح سدا مسکراتی رہا کرو۔ تم ہری بھری ٹہنی پر لگا اک پھول ہو تمہیں ہمیشہ کھلا رہنا چاہئے۔ مسکراتے اور خوشبو لٹاتے رہنا چاہئے۔ تمہیں غمگین یا اداس ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

کلثوم کا اس وقت جی چاہا کہ وہ یاقوت کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے سینے پر سر رکھ کر خوب روئے۔ خوشی کے آنسو روئے۔ اچانک اس نے گھڑی دیکھی پونے دو ہو رہے تھے۔

"ہائے ہائے۔ بڑی دیر ہوگئی۔ مجھے اب کالج جانا ہے۔"

"کچھ دیر اور رک جاؤ کلثوم! ایک پیالی کافی اور پی لو۔"

"نہیں اب مجبور نہ کریں۔ سچ میرا جانا بڑا ضروری ہے۔ اگر نہ گئی تو خواہ مخواہ کی بدنامی ہوگی۔ گھر والے پہلے ہی میرے بارے میں بڑی سن گن رکھ رہے ہیں۔"

"انہیں کیسے معلوم ہوگا کہ تم یہاں بیٹھی ہو؟"

کلثوم نے اپنا نازک ہاتھ اپنے پھول ایسے ہونٹوں پر رکھ کر کہا۔

"خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کریں۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ یاقوت نے ٹیکسی منگوانی چاہی تو کلثوم نے کہا۔

"میں چوک میں جا کر خود ہی لے لوں گی۔ آپ یہاں سے الگ ہو جائیں۔ جانے کیوں آج مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔"

''تم خواہ مخواہ ڈر رہی ہو۔ چلو میں بھی چوک تک تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''ہائے نہیں آپ چلے ہی جائیں۔''

''ایسی بھی کیا بات ہے۔ اچھا یہ بتاؤ اب کب ملوگی؟''

''کچھ کہہ نہیں سکتی۔ خط لکھ بھیجوں گی۔''

کلثوم کا دل کسی انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ وہ یاقوت کے ساتھ بادل ناخواستہ ریگل والے چوک کی طرف چل پڑی۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئے ہوں گے کہ اچانک کلثوم کا دل اچھل کر اس کے حلق میں آ گیا۔ ٹانگیں ایک دم برف ہو گئیں اور پاؤں من من وزنی ہو گئے۔ سامنے سے اس کا بڑا بھائی ہاتھ میں چمڑے کا تھیلہ اٹھائے چلا آ رہا تھا۔

''ہائے میں مرگئی۔ بھائی جان آ رہے ہیں۔''

''ہائے خدا کے لئے الگ ہو جائیں۔ خدا کے لئے چلے جائیں۔ میں مر جاؤں گی۔''

لیکن اس اثنا میں اس کا بڑا بھائی بالکل نزدیک آ گیا تھا۔ اس نے کلثوم کے قریب سے گزرتے ہوئے سر سے لے کر پاؤں تک اپنی بہن کو دیکھا اور انتہائی خاموشی کے ساتھ آگے نکل گیا۔ کلثوم کے جسم کا خون خشک ہو گیا تھا۔ اس کی زبان سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔

''ہائے اب کیا ہوگا؟ انہوں نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔''

''میرا خیال ہے انہوں نے تمہیں نہیں پہچانا۔ ورنہ وہ ضرور بلا لیتے۔''

''ہائے آپ نہیں جانتے۔ اب خدا جانے میرا کیا حشر ہوگا۔ خدا کے لئے اب آپ تو الگ ہو جائیں۔ میرے اللہ! میں کیا کروں۔''

''حوصلہ رکھو کلثوم! میں ہر حال میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''خدا کے لئے اس وقت فوراً مجھ سے الگ ہو جائیں۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔''

یاقوت جلدی سے الگ ہو کر فٹ پاتھ پر چڑھ گیا اور بس سٹاپ پر کھڑا ہو کر کلثوم کو اکھڑی اکھڑی بے ربط چال کے ساتھ چوک کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ چوک میں جا کر کلثوم نے ایک خالی تانگہ دیکھا۔ اس میں جلدی سے سوار ہو گئی اور کوچوان سے کہا۔

''۔۔۔۔۔۔۔کالج۔۔۔۔۔۔۔جلدی۔''

''اچھا بی بی جی۔''

اور تانگہ کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھوڑا اپنی روایتی لاہوری چال کے ساتھ چل رہا تھا اور کلثوم اڑ کر اپنے کالج پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اسے ایک خوش فہمی یہ بھی تھی کہ شاید بھائی جان نے اسے نہ پہچانا ہو۔

''بابا! تانگہ تیز چلاؤ۔''

''اچھا بی بی جی۔''

کوچوان نے گھوڑے کو ہلکا سا چابک رسید کیا۔ گھوڑا تھوڑا سا اچھلا۔ دو قدم تیز چلا اور پھر وہی پرانی روایتی چال چلنے لگا۔ کلثوم کا جی چاہا کہ وہ چابک اپنے ہاتھ میں لے کر گھوڑے کو اتنا مارے کہ وہ گولی کی طرح بھاگتا اس کے کالج پہنچ جائے۔ لیکن نہ وہ چابک اپنے ہاتھ میں لے سکی اور نہ گھوڑے کی چال میں فرق آیا۔ خدا خدا کر کے اس کا کالج آیا۔ اس نے کوچوان کو اٹھنی پرس میں سے نکال کر دی اور ابھی تانگے میں سے اتر ہی رہی تھی کہ ایک ٹیکسی پیچھے سے اس کے پاس آ کھڑی ہوگئی۔ اندر سے اس کے بھائی جان دروازہ کھول کر باہر نکلے اور بولے۔

''آؤ کلثوم گھر چلیں۔ کالج جانے کی اب ضرورت نہیں۔''

کلثوم پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ وہ ایک پل کے لئے بے جان لاش کی طرح وہیں رکی رہی۔ پھر آہستہ سے ٹیکسی میں اپنے بھائی جان کے ساتھ سوار ہوگئی اور ٹیکسی ان کے گھر کی طرف چل پڑی۔ کلثوم نے اس قدر پچھتاوے ملال' ذہنی پریشانی اور خوف کے ساتھ ٹیکسی کا سفر کبھی نہیں کیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سیاہ برقعے میں لپٹی ہوئی ایک لاش ہے اور اس کا بھائی اسے دفنانے قبرستان لئے جا رہا ہے۔ اس کے بھائی جان نے سارا راستہ کوئی بات نہ کی۔ خوف سے کلثوم کی زبان خشک ہو کر لکڑی ہوگئی تھی اور اس کا دل تیز سے دھڑک رہا تھا۔ ایک بار تو اسے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہوگئی ہے اور سڑک کی دونوں جانب کی دکانیں اور فٹ پاتھ کے لوگ خواب میں پیچھے کی طرف بھاگے جا رہے ہیں۔ ٹیکسی ان کی گلی کے باہر جا کر کھڑی ہوگئی۔ بھائی جان نے بل ادا کیا اور کلثوم کو ساتھ لے کر گلی میں سے گزر اپنے مکان میں آ گئے۔ وہ مکان جس کے دروازے میں کلثوم ہنسی خوشی بلبل کی طرح چہکتی ہوئی داخل ہوا کرتی تھی' جس کی دیواریں اسے باہر کی پریشانیوں سے نجات دلایا کرتی تھیں اور جس کے ہر کمرے میں اس پر اطمینان وسکون کی بارش ہوا کرتی تھی آج ایک ناگہانی بلا کی طرح منہ پھاڑے اس کی ہڈی ہڈی چبا جانے کو تیار کھڑے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک بار اس مکان میں داخل ہوگئی تو پھر زندہ سلامت باہر نہ نکل سکے گی۔ وہ اندر داخل ہوگئی اور بھائی جان نے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند ہو گیا۔ کالج' یاقوت' شہر محبت' سویٹ پنیر کے پھولوں اور گارڈینیا کی مہک اور سنہری دھوپ اور ہوٹل کی گیلری کی خوشبوئیں

بھری پر سکون دنیا کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔ اور سب کچھ باہر کا باہر رہ گیا۔ اس کے محبوب کی پیار بھری باتیں' پر جوش ہم آغوشیاں' دلگداز سرگوشیاں' گلاب کے پھول اور گلدان والی پوکلپٹس کی شاخیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہر چیز' ہر شے باہر گلی میں کھڑی کلثوم کے بند دروازے کا منہ تکتی رہ گئی۔

مکان میں آ کر کلثوم کے بھائی جان نے صرف اتنا کہا۔

''تم اپنے کمرے میں جاؤ۔''

اور خود اوپر چلے گئے۔ کلثوم اپنے کمرے میں آ کر پلنگ پر گر پڑی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی۔ اس کی آنکھوں کا سارا سرمہ بہہ گیا۔ پلکیں ایک دوسری سے جڑ گئیں اور سویٹ پنیر کے پھول بالوں میں دب کر ٹوٹ گئے اور اس کی پنکھڑیاں پنکھڑیاں بکھر گئیں۔ کوئی پندرہ منٹ بعد اس کی بھاری بھر کم باوقار سفید بالوں والی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے اندر آ کر کلثوم کو بالوں سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیا اور بولی۔

''اگر تجھ میں شرم کا ذرا سا بھی مادہ ہے تو ڈوب کر مر جا۔ تجھے ایسا کرتے ہوئے ذرا غیرت نہ آئی۔ تجھے یہ بھی خیال نہ آیا کہ تیرے بھائیوں کو معلوم ہو گیا تو وہ کیا کہیں گے۔ باپ کو پتہ چل گیا تو وہ کیا سوچے گا؟ بے شرم! تو یہاں سے کالج جاتی اور وہاں جا کر اس حرامزادے کے ساتھ سیریں کرتی ہے؟ بتا وہ کون ہے سور کا بچہ؟ بول! کون ہے ہو اور تیرا اس کے ساتھ کیا تعلق تھا؟ غضب خدا کا گھر میں آدھی درجن بھابیاں بیٹھی ہیں۔ اگر انہیں ذرا سی بھنک پڑ گئی تو وہ ہمارے خاندان کو جگہ جگہ بدنام کر دیں گی۔ بے حیا! تجھے اس بات کا بھی خیال نہ آیا؟''

کلثوم چہرہ بازوؤں میں چھپائے پلنگ پر بیٹھی روئے جا رہی تھی۔ اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ اس نے ماں کے آگے جھوٹ بولا اور کہا کہ وہ اس نوجوان کو بالکل نہیں جانتی۔ اسے تو معلوم بھی نہیں کہ اس کے ساتھ کون چلا جا رہا تھا۔ وہ تو اکیلی کالج واپس آ رہی تھی

''اور تو گئی کس کے پاس تھی؟''

کلثوم نے ہچکیوں کے درمیان ایک اور جھوٹ بولا۔

''اپنی سہیلی کے گھر کتاب لینے گئی تھی''

ماں نے زور سے ایک طمانچہ اس کے گال پر دے مارا اور جھنجھلا کر کہا۔

''بکواس بند کر بدبخت! ایک تو گناہ کیا اور پھر جھوٹ بولتی ہے۔''

کلثوم سر جھکا کر زار و قطار روتی چلی گئی۔ وہ صرف رونا چاہتی تھی۔ اپنے آپ پر، اپنی قسمت پر اور اس تقدیر پر جس نے پھول کے بعد تھی پر کانٹوں کی قطاریں لگا رکھی ہیں۔ رونے سے اس کے جی کا غبار نکل رہا تھا۔ ذہن کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔

"اب الماری میں لگی ان کتابوں کو چولہے میں جھونک اور اسی کمرے میں پڑی رہ۔ اگر یہاں سے ذرا بھی قدم باہر نکالا تو تیرے بھائی تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ کمینی! تیرے تو اتنے بھائی ہیں کہ اگر ایک ایک تھپڑ بھی ماریں تو تو زمین میں زندہ گڑ جائے۔"

کلثوم کے بھائی اپنی اکیلی بہن سے بے حد پیار کرتے تھے۔ اس کی ہر خواہش دل و جان سے پوری کر دیتے تھے۔ اسے نئے کپڑے بنوا کر دیتے تھے۔ اسے جیب خرچ کے علاوہ بھی پیسے دیا کرتے تھے۔ وہ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بہن گھر سے باہر غیر مرد کے ساتھ مال روڈ پر آوارہ پھرے اور ان کی بے حد قیمتی اور برسوں کی بنی بنائی عزت کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کرے۔ انہیں اس حادثے کا بڑا دکھ ہوا۔ ان کا گھر اور ان کی اپنی زندگیاں اس قسم کے مذموم حادثوں سے پاک تھیں۔ اسی رات وہ اپنے باپ کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اپنے خاندان کو بدنامی سے بچانے کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگے۔ آخر سب نے مل کر یہی فیصلہ کیا کہ کہیں شادی کر دی جائے۔ اگلے ہی روز کلثوم کالج سے اٹھوالی گئی۔ اپنی بیویوں سے انہوں نے یہ کہا کہ چونکہ کلثوم کی صحت خراب رہتی ہے اس لئے یہ فیصلہ کیا گیا ہے اتنا پڑھ لکھ کر وہ کیا کرے گی؟ کلثوم کو اس بات کا بے حد دکھ ہوا۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکتی تھی اور جب اسے بھابیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ اس کی شادی کے لئے بر تلاش کیا جا رہا ہے تو وہ پریشان ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ یاقوت کے سوا کسی دوسرے شخص سے شادی کرنے کا مطلب سوائے تباہی، بدنامی اور ذلت و رسوائی کے اور کچھ نہیں۔ مگر یہاں بھی وہ مجبور تھی۔ زبان سے احتجاج کا ایک لفظ نہ کہہ سکتی تھی۔ بھائی صرف اپنی بیویوں کے سامنے اس سے رسمی طور پر بول لیتے تھے۔ ویسے انہوں نے کلثوم سے بول چال بند کر رکھی تھی اور وہ اب صرف اس فکر میں تھے کہ کسی طرح کلثوم کا فرض سر سے ادا کر دیا جائے۔ کسی طرح اس کی شادی کر کے اسے اپنے گھر روانہ کر دیا جائے۔

ایک ہفتہ گزر گیا اور کلثوم کا کوئی خط نہ آیا۔

یاقوت اب پریشان ہو گیا۔ پہلے اس کا خیال تھا کہ کلثوم کو وہم ہوا تھا وہ اس کا بھائی نہیں تھا۔ اب اسے بھی یقین ہو گیا کہ وہ اس کا بھائی تھا۔ ویسے بھی بہن اپنے بھائی کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتی۔ تو کیا کلثوم کو اس کے بھائیوں نے گھر میں بند کر دیا ہے؟ کیا انہوں نے اس کا کالج جانا بند کر دیا ہے؟ انہوں نے اسے مارا بھی ہو گا؟ کلثوم کس حال میں ہو گی؟ اس قسم کے خیالات یاقوت کے دماغ و

دل میں چکر لگانے لگے۔ اس نے سوچا کیوں نہ کالج جا کر معلوم کیا جائے۔ ایک روز وہ صبح صبح کالج پہنچ گیا۔ کوئی گھنٹہ بھر وہ کالج کے دروازے کے سامنے ذرا ہٹ کر کھڑا لڑکیوں کو اندر داخل ہوتے دیکھتا رہا۔ ان میں سے کلثوم کوئی بھی نہیں تھی۔ جب سب لڑکیاں اندر جا چکیں تو وہ کالج کے دفتر میں گیا اور اس نے کلرک سے کلثوم کے بارے میں پوچھا۔ بڈھے کلرک نے مشتبہ نگاہوں سے یاقوت کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور رجسٹر کے ورق الٹنے لگا۔ پھر ایک جگہ انگلی رکھ کر بولا۔

''کالج سے اس کا نام کٹ گیا ہے۔''

ٹھیک ہے۔ وہ اس کا بھائی ہی تھا۔ ان سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ کلثوم یاقوت سے محبت کرتی ہے اور اس کے ساتھ مال روڈ کے ہوٹلوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ اسے کالج سے اٹھوا لیا گیا ہے۔ مگر اب اسے کس طرح ملا جائے۔ یاقوت کو اس کے گھر کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ معلوم بھی ہوتا تو وہ اسے خط نہ لکھ سکتا تھا۔ لیکن کلثوم تو خط لکھ کر سب کچھ بتلا سکتی تھی۔ اس نے اتنے دن ہو گئے خط بھی نہیں لکھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس کو گھر میں بند کر دیا گیا ہے اور اس کی نقل و حرکت پر کڑا پہرہ بٹھا دیا گیا ہے۔ یاقوت کو بڑا دکھ ہوا کہ محض اس کی وجہ سے بے چاری کلثوم پر اتنی آفت آئی اور وہ اپنے محبت کرنے والے بھائیوں کے سامنے بدنام اور ذلیل ہوئی۔ یاقوت کی روزمرہ زندگی میں آب کوئی دلکشی نہ رہی تھی۔ نجمہ شادی کر کے الگ ہو بیٹھی تھی اور کلثوم کو زبردستی اس سے جدا کر دیا گیا تھا۔ یاقوت کے لئے اتنے بڑے شہر لاہور میں اب سوائے اداسی اور پریشانی کے اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔ وہ رات رات بھر لیٹ لیٹ کر پڑھنے کی کوشش کرتا اور دن کو بارہ بجے اٹھتا۔ منہ ہاتھ دھو کر زہر مار کرتا اور تھوڑی سی آوارہ گردی کے بعد پھر اپنے آپ کو ہوٹل کے کمرے میں بند کر لیتا اور اگلے روز دوپہر کو باہر نکلتا۔

کسی وقت وہ حکیم یا پری کے پاس جا بیٹھتا اور سگریٹ سلگائے خاموشی سے ان کی باتیں سنا کرتا۔ حکیم کی سابقہ بیوی داری کا کسی کو کچھ علم نہ تھا۔ اس کا عاشق گاباسنار جو اسے بھگا کر لے گیا تھا واپس گھر آ گیا تھا۔ اس نے لوگوں کو یہی کہانی سنائی تھی کہ داری کراچی میں اسے دھوکا دے کر کسی دوسرے شخص کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ خود اسے ایک شخص کے پاس فروخت کر آیا تھا۔ داری کو ساتھ لے کر وہ پہلے سیدھا حیدرآباد پہنچا۔ وہاں اس نے اپنے ایک دوست کے ہاں ڈیرا ڈالا۔ جو تھوڑا بہت سونا وہ ساتھ لے گیا تھا دونوں اسے بیچ کر کچھ روز عیش کرتے رہے۔ جب پیسے ختم ہو گئے تو سنار کے طرح دار لونڈے کو محنت و مشقت کرنی پڑی اور یہ کام اس نے کبھی کیا نہ تھا۔ وہ تو داری سے محض عشق کرتا تھا اور اس سے عیاشی کرنا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر جان مار کر محنت مزدوری کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ چنانچہ دونوں کی لڑائیاں ہونے لگیں۔ جس دوست کے پاس وہ دونوں جا کر ٹھہرے تھے اس نے ان

لڑائی جھگڑوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔اس نے داری کو گابے کی طرف سے ورغلانا شروع کر دیا اور اسے ایسے سبز باغ دکھلائے کہ داری اپنے عاشق سے برگشتہ ہوگئی۔ گابے کو اس حقیقت کا علم ہوا تو اس نے اپنے دوست کو لعنت ملامت کی۔ دوست نے کہا۔

"تم یونہی اپنی اور داری کی زندگی خراب کر رہے ہو۔ وہ تمہارے ساتھ اب نہیں رہ سکتی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم بھی آپس کے تعلقات خراب نہ کریں۔ تمہارا جو نقصان ہوا ہے وہ مجھ سے لے لو اور داری کو میرے حوالے کر دو۔"

گابا پہلے ہی داری سے تنگ آ چکا تھا۔ علاوہ بریں اسے اپنے گھر کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ اسے اپنے دوست کی یہ تجویز پسند آئی اور اس نے پانچ سو روپوں کے عوض داری کو اپنے دوست کے ہاتھ فروخت کر دیا اور روپے جیب میں ڈال کر لاہور جانے والی ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ داری کو اس سودے بازی کا قطعاً کوئی علم نہیں تھا۔ اپنے بے وفا عاشق سے چھٹکارا پا کر وہ بڑی خوش ہوئی اور دوسرے عاشق کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی۔ دوسرے عاشق نے کچھ روز اسے اپنے پاس رکھا اور جب اس کا بھی جی بھر گیا تو اس نے سکھر کے ایک بردہ فروش کے پاس داری کو دو ہزار روپوں کے عوض بیچ دیا۔ داری کو وہ کسی بہانے بردہ فروش کے مکان پر لے گیا۔ یہ مکان شہر سے کوئی دو میل دور ایک ویران کنوئیں کے پاس تھا۔ اس نے داری سے یہ کہا تھا کہ یہاں اس کا ایک چچا رہتا ہے۔ کچھ روز یہاں رہیں گے اور پھر واپس حیدر آباد آ جائیں گے۔ لیکن دوسرے ہی روز وہ بردہ فروش سے دو ہزار روپے نقد وصول کر کے داری کو اکیلا چھوڑ کر حیدر آباد واپس چلا گیا۔

اب داری بردہ فروش کے پاس اکیلی رہ گئی۔ جب اسے صورت حال کا علم ہوا تو وہ بہت روئی پیٹی۔ بڑا شور مچایا مگر بڑی بڑی مونچھوں والے بردہ فروش نے اسے اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گئی اور چھ روز تک بستر پر پڑی رہی۔ اب داری کو اس شخص سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ ہر وقت چاقو اور پستول جیب میں ڈالے اس کے ارد گرد منڈلاتا رہتا۔ ایک ماہ کی تربیت کے بعد جب بردہ فروش کو یقین ہو گیا کہ داری اب اس کے چنگل سے نکل کر کہیں نہیں جا سکتی۔ جب اس نے داری کو یقین دلا دیا کہ اگر اس نے کبھی فرار ہونے کی کوشش کی تو اس کے آدمی اسے ہلاک کر دیں گے۔ تو اس نے داری کو سندھ کے بڑے بڑے آدمیوں کے ہاں بھیجنا شروع کر دی اور داری گناہ کی دلدل میں نیچے دھنسنے لگی۔ کچھ عرصہ بعد وہ شخص داری کو سکھر سے میر پور خاص لے گیا وہاں جا کر اس نے داری کو چار ہزار کے عوض ایک دلال کے پاس فروخت کر دیا اور وہ دلال داری کو لے کر کراچی چلا گیا۔ اب داری پوری طوائف بن چکی تھی اور اس نے پچھلی زندگی کو یکسر بھلا کر نئی زندگی کو مکمل طور پر اپنا لیا تھا۔ آخر پیچھے اس کا کون تھا جس کے پاس وہ جاتی۔ ایک باپ تھا جس نے خود اسے روپوں کے لالچ میں بڈھے حکیم سے بیاہ دیا تھا۔ اس اعتبار سے پہلی بردہ فروشی تو اس کے باپ نے کی تھی۔ اس گناہ کی زندگی

میں چاہے کتنی برائیاں تھیں لیکن کم از کم داری اپنے ماحول میں آزاد اور بے فکر ضرور تھی۔ اور اس کے پاس روپے بھی ہر وقت رہتے تھے۔ ابھی وہ جوان تھی۔ ابھی روپوں کی ریل پیل کا زمانہ تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ جب اس کی جوانی ڈھل جائے گی تو وہ کراچی کے بازاروں میں بھیک مانگنے کے لئے اکیلی چھوڑ دی جائے گی۔ اور گناہ کی زندگی میں جوانی دنوں میں ڈھل جایا کرتی ہے۔

اپریل کا مہینہ آ گیا۔ باغوں میں گلاب اور مولسری کے پھول کھل گئے۔ سویٹ پنیر اور گیندے کا موسم ختم ہو گیا۔ موتیا کی شاخوں میں کلیاں چٹکنے لگیں۔ آم کی شاخوں میں بور آ گیا۔ گرمی آ گئی۔ درختوں کی چھاؤں میں آرا ملنے لگا۔ ٹھنڈی چھاؤں بھلی لگنے لگی۔ گرم کپڑے صندوقوں میں بند کر دیئے گئے۔ دھوپ میں حدت پیدا ہو گئی۔ کلثوم کے لئے بر تلاش کر لیا گیا۔ ان کے اپنے ہی رشتہ داروں میں ایک لڑکا حال ہی میں کویت سے چھٹی پر آیا تھا۔ وہ وہاں تیل کمپنی میں کاؤنٹنٹ تھا اور کافی تنخواہ پاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ٹیپ ریکارڈز ریڈیو اور ڈھیر سارا کپڑا لایا تھا۔ کلثوم کی ماں نے رشتے کی بات کر دی لڑکے والے مان گئے۔ منگنی ہو گئی۔ لڑکا مئی کے پہلے ہفتے واپس کویت جا رہا تھا۔ لڑکی والے بھی جلد سے جلد شادی کے فرض سے عہد برآ ہونا چاہتے تھے۔ چنانچہ مئی کی یکم تاریخ شادی کے لئے طے ہو گئی۔ کلثوم کی امیدوں کا آخری چراغ بھی گل ہو کر رہ گیا۔

اس اثنا میں گھر میں اس پر کڑی نگاہ رکھی جانے لگی۔ اسے اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ وہ خط کا ایک پرزہ ہی باہر بھجوا سکے۔ خود اس کے گھر سے باہر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کلثوم دو ماہ سے بند کمرے میں پھڑ پھڑا رہی تھی۔ اس کا وزن کم ہو گیا تھا۔ اس سے بے انتہا محبت کرنے والے بھائی اور ماں باپ اس کی ذرا سی غلطی پر سخت سنگدل ثابت ہوئے تھے۔ کلثوم کو اتنی اجازت بھی نہ تھی کہ وہ باہر سے آئی ہوئی کسی عورت سے بات ہی کر لے۔ یہ سوچ کر اس کا دل تڑپ اٹھتا کہ یاقوت کا اس کی جدائی میں کیا حال ہوگا؟ وہ کیا سوچ رہا ہوگا؟ ایک روز کلثوم نے جی مضبوط کر کے یاقوت کو ایک پرچہ لکھا۔ اسے لفافے میں ڈال کر باہر ایڈریس لکھا اور اس عورت کا انتظار کرنے لگی جو ان کے ہاں برتن مانجھنے آیا کرتی تھی۔ دوپہر کے بعد جب وہ عورت آئی اور برتن وغیرہ مانجھ کر واپس جانے لگی تو کلثوم نے اشارے سے اسے اپنے کمرے میں بلایا اور خط دے کر کہا۔

''خالہ! خدا کے لئے میرا یہ خط چپکے سے لیٹر بکس میں ڈال دینا اور کسی کو بتانا بالکل نہیں۔ یہ لو پانچ روپے تم بچوں کو مٹھائی لے دینا۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ تم میری بڑی اچھی خالہ ہو۔''

اس عورت نے ادھر ادھر دیکھ کر خط اور پانچ روپے کا نوٹ لے کر دوپٹے کے پلو سے باندھ لیا اور چپکے سے باہر نکل گئی۔ اب کلثوم کو پہلے سے زیادہ پریشانی نے آن گھیرا کہیں یہ عورت ماں جی کو جا کر خط نہ دیدے کیا خبر وہ خط پوسٹ ہی نہ کرے۔ یا اگر کرے بھی تو

کسی ایسے لیٹر بکس میں ڈال دے جو خراب ہو چکا ہو اور جہاں کبھی ڈاکیہ نہ آیا ہو۔ دوسرے روز جب وہ عورت برتن مانجھنے آئی تو کسی بہانے کلثوم کے کمرے میں آ گئی۔ کلثوم نے بے تابی سے پوچھا۔

''خط ڈال دیا تھا خالہ؟''

''ہاں بی بی ڈال دیا تھا۔ فکر نہ کرو۔ ہوٹل کے باہر جو لال بھبھکا لگا ہے۔ اس میں ڈال دیا تھا۔ بی بی ہم لوگ جس بات کا وعدہ کرتے ہیں پورا کرتے ہیں۔''

اگر وہ سچ بول رہی تھی تو اس نے خط یاقوت کے ہوٹل کے باہر والے لیٹر بکس میں ڈالا تھا۔ کلثوم کچھ مطمئن ہو گئی۔ اگر خط پہنچ گیا تو یاقوت کو تمام حالات کا علم ہو جائے گا۔ کم از کم وہ کلثوم کو بے وفا تو نہیں کہے گا۔

دوسرے روز سہ پہر کی ڈاک میں یاقوت کو کلثوم کا خط مل گیا۔ وہ پری کے ہاں سے اٹھ کر کپڑے تبدیل کرنے ہوٹل آیا کہ کاؤنٹر کے بورڈ پر اس کا خط لگا ہوا تھا۔ اس نے کلثوم کا ہینڈ رائیٹنگ پہچان لیا۔ لفافہ چاک کر کے اس نے وہیں کھڑے کھڑے سارا خط پڑھ لیا۔ کلثوم نے لکھا تھا۔

''میرے پیارے یاقوت! تم کہاں ہو؟ یوں لگتا ہے جیسے تمہیں دیکھے تمہاری باتیں سنے برسوں گزر گئے ہیں۔ آہ! میں کتنی بدنصیب ہوں کہ اپنے سفر کی پہلی منزل پر ہی لوٹ لی گئی اور دنیا نے زنجیریں ڈال کر مجھے قید خانے میں ڈال دیا۔۔۔۔۔۔۔''

اس کے بعد کلثوم نے ہوٹل والی آخری ملاقات کے بعد کی ساری دکھ بھری روئیداد بیان کی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے ایک کمرے میں قید کر دیا گیا ہے۔ اس کے آنے جانے پر سخت پابندی ہے۔ اسے کالج سے اٹھوا لیا گیا ہے۔ وہ نہ کہیں باہر جا سکتی ہے اور نہ کوئی اسے ملنے گھر آ سکتا ہے۔ دو ایک بار اس کی سہیلیاں اس سے ملنے آئیں تو ماں جی نے کہہ دیا کہ وہ کراچی اپنے بڑے بھائی کے پاس گئی ہے۔

''۔۔۔۔۔۔۔۔انہوں نے میری منگنی کر دی ہے۔ مئی کی پہلی تاریخ کو میری شادی ہو رہی ہے۔ اس روز مجھے دلہن بنا کر سرخ جوڑا پہنا کر ڈولی میں بٹھلا کر' قبرستان لے جایا جائے گا۔ مجھے زندہ دفن کر دیا جائے گا اور میں ایک آہ بھی نہ بھر سکوں گی۔ اونچا سانس بھی نہ لے سکوں گی۔ تمہیں یاد کروں گی اور روتی رہوں گی۔ روتی رہونگی کاش! ایسا کبھی نہ ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟ کیا اب میری شادی تم سے نہیں ہو سکتی؟ یاقوت یہ کیا ہو گیا۔ ہوٹل کی گیلری میں بیٹھے بیٹھے ہمیں کس کی نظر کھا گئی۔ کیا اس نسواری برقعے والی نے ہمیں نظر لگا دی؟ وہ جاتے ہوئے ہم دونوں کو غور سے دیکھ رہی تھی! کاش اس روز ہم وہاں نہ جاتے۔ تمہارے کمرے میں ہی

بیٹھے رہتے۔ یہ کیسا انقلاب آ گیا۔ پہلی کو میرا بیاہ ہو رہا ہے اور سات مئی کو اپنے خاوند اپنے گورکن کے ساتھ کراچی چلی جاؤں گی جہاں سے بحری جہاز میں بٹھلا کر وہ مجھے کویت لے جائے گا اور پھر جانے کب اور کس حال میں تم سے ملاقات ہو؟ جانے پھر جانے کب ملیں پرانے ساتھی! میں نے تمہیں کبھی تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔ مگر آج میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ میں یہاں کچھ نہیں کر سکتی۔ تم میری مدد نہیں کر سکتے۔ آسمان بہت دور ہے۔ زمین میرے پاؤں تلے سے کھینچ دی گئی ہے۔ تم مجھ سے لاکھوں میل دور ہو گئے ہو۔ میں کیا کروں؟ کس کو جا کر دل کا حال سناؤں۔۔۔۔۔۔۔۔؟"

آخر میں کلثوم نے آنسوؤں کی جھڑی میں لکھا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ اس عورت کو جس نے خط پوسٹ کیا ہے ہوٹل جواب لانے کے لئے بھیجے۔ خط پڑھ کر یاقوت نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر ایک سرد آہ بھری۔ خط جیب میں رکھا اور اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ سیڑھیوں کے پاس ہی پہنچا تھا کہ ایک بیرا اس کے پاس آیا اور جھک کر بولا۔

"صاحب! ایک عورت آپ کا انتظار کر رہی ہے۔"

یاقوت نے حیرانی سے پوچھا۔

"کہاں؟"

"کیبن نمبر پانچ میں صاحب!"

وہ بڑا حیران ہوا۔ اسے کون عورت ملنے آ سکتی ہے۔ کہیں کلثوم ہی نہ ہو۔ ضرور وہی ہوگی۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی خالہ کے ساتھ گھر سے نکل آئی ہوگی۔ میری کلثوم! میں اسے اپنے گلے سے لگا لوں گا۔ یاقوت تیز تیز قدم اٹھاتا کیبن کی طرف بڑھا اور قریب آ کر جلدی سے پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔

"تم؟"

یاقوت کے منہ سے نکل گیا۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں"

کیبن میں نسواری برقعے کا نقاب اٹھائے نجمہ بیٹھی تھی۔ شادی کے بعد پہلے موسم بہار میں اس کا سنہری رنگ نکھر کر زیادہ شگفتہ ہو رہا تھا اور نسواری آنکھوں میں خوش فکری خوش وقتی اور لاپروائی کی چمک تھی۔ کانوں میں سونے کے جھمکے تھے اور انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھی۔ وہ یاقوت کی طرف دیکھ کر تھوڑا تھوڑا مسکرا رہی تھی جیسے اس کی پریشاں حالی پر خوش ہو رہی ہو۔ یاقوت کو اس

کی یہ مسکراہٹ بری لگی۔ وہ چپکے سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ نجمہ نے پوچھا۔

''مجھے یہاں دیکھ کر تمہیں حیرانی ضرور ہوگی۔''

یاقوت نے سگریٹ سلگا کر دیا سلائی ایش ٹرے میں توڑ کر پھینکتے ہوئے کہا۔

''کیوں نہیں۔ اس لئے کہ یہ گھٹیا ہوٹل ہے اور تم اپنے خاوند کے ساتھ اعلیٰ ہوٹلوں میں جانے کی عادی ہو۔''

نجمہ سنجیدہ ہوگئی۔ وہ اپنی انگلیوں میں نقاب کا تسمہ مروڑنے لگی۔

''اس روز تمہارے ساتھ کون لڑکی بیٹھی تھی؟''

یاقوت نے مسکرا کر کہا۔

''کیا میں نے تم سے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اس روز کون آدمی تھا؟''

''وہ تو میرا خاوند تھا۔''

''تو وہ میری بیوی تھی۔''

نجمہ چپ سی ہوگئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے سر پر ٹھنڈی برف کی سل رکھ دی ہو۔ تو کیا یاقوت نے شادی کر لی تھی؟ اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ تو اسے ساری زندگی اپنی محبت میں آہ وزاری کرتے' اپنے غم میں حیران و پریشان دیکھنا چاہتی تھی۔ پھر یہ کیا ہوا کہ اس نے شادی کر لی اور نجمہ کی جدائی کے غم سے نجات حاصل کر لی۔

''شادی کب کی؟''

''ایک مہینہ ہوا ہے۔''

''اور ہمیں خبر نہ کی۔

''تم نے مجھے اپنی شادی کی خبر کی تھی؟''

''میں بھی مجبور تھا۔ میں نے کسی کو خبر نہیں کی۔ میں نے کسی کو اطلاع نہیں دی۔''

''کیسی ہے تمہاری بیوی۔''

''گلاب کے پھول کی مانند۔''

نجمہ پر اوس پڑ گئی۔ اس سے آگے اس نے کلثوم کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ یاقوت

نے کہا۔

''تمہارے لئے چائے منگواؤں۔''

''نہیں شکریہ۔''

''میں پوچھ سکتا ہوں تم اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر میرے پاس کیوں آئیں؟''

نجمہ نے نقاب کو سر پر اچھی طرح درست کرتے ہوئے آہ بھری اور کہا۔

''میں ادھر اپنی ایک رشتہ کی بہن کے گھر گئی تھی۔ واپسی پر سوچا کہ تمہیں دیکھتی چلوں۔''

''بڑی مہربانی کی میرے حال پر!''

اس کے بعد کیبن میں خاموشی چھا گئی۔ یاقوت سگریٹ پیتا رہا اور کلثوم کے بارے میں سوچتا رہا اور نجمہ نقاب کا تسمہ انگلیوں پر لپیٹتی رہی اور سوچتی رہی کہ وہ کس طرح بات شروع کرے۔ دو محبت کرنے والوں کی یہ عجیب ملاقات تھی جب کہ دونوں میں سے کسی کو بھی محبت بھری باتیں کرنے کی خواہش نہیں تھی۔ آخر نجمہ نے کہا۔

''میں ایک بات کہوں برا تو نہیں مانو گے؟''

''بالکل نہیں۔'' یاقوت نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا۔

نجمہ نے آہستہ سے کہا۔

''میرے خط تم نے کہاں رکھے ہیں؟''

یاقوت سمجھ گیا کہ وہ اپنے پرانے محبت بھرے خط واپس لینے آئی ہے جو اس نے شادی سے پہلے بے پایاں محبت کے جوش میں لکھے تھے۔ جو کبھی حنا کے عطر میں بسا کر وہ یاقوت کو بھیجا کرتی تھی اور جن کی ایک ایک سطر اب بدنامی کا سانپ بن کر اسے ڈرا رہی ہے۔

''میرے پاس پڑے ہیں۔ کیوں؟''

نجمہ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر نظریں جھکائے ہوئے کہنے لگی۔

''ڈرتی ہوں کہیں تم سے ادھر ادھر ہو گئے تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔ میرے خاوند کو ابھی تک کسی بات کا علم نہیں ہے۔ وہ مجھ سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ اگر کبھی انہیں میرا ایک بھی خط ہاتھ لگ گیا تو یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں گے۔''

یاقوت نجمہ کی ذہنی حالت پر مسکرا دیا۔اس نے سگریٹ بجھا کر کہا۔

’’یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تمہارا خاوند تم سے محبت کرتا ہےاور زیادہ خوشی کی باتیہ ہے کہ تمہیں بھی اس کا بے حد خیال ہے۔لیکن کیا یہ خط تم نے اس لئے مجھے لکھے تھے کہ ایک روز واپس منگوا کر انہیں آگ لگا دو گی؟

اگر اس خوبصورت سجے سجائے گھر کو آگ ہی لگانا تھی تو اسے اتنی محبت' اتنی جانفشانی سے بنایا کیوں تھا اس کے ایک ایک کمرے کو گلاب کے پھولوں سے سجایا کیوں تھا۔اس کے ریشمی پردوں کو حنا کے عطر میں بسایا کیوں تھا؟اس میں اگربتیاں کیوں سلگائی تھیں۔اس کے آتش دان میں لکڑیاں جلا کر سماوار کیوں گرم کیا تھا۔میں تمہارے خط تمہیں ابھی واپس کئے دیتا ہوں۔لیکن کیا تم انہیں اپنے ساتھ لے جاسکو گی؟کیا تم اپنی مردہ محبت' اپنے مرے ہوئے بچے کی لاش اٹھا کر گھر لے جاسکو گی؟اگر تم میں حوصلہ ہے تو میں ابھی تمہیں تمہارے خطوں کی صندوقچی لائے دیتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔‘‘

نجمہ کی آنکھوں میں آنسوں آگئے۔اسے اپنی پہلی اور آخری محبت کا ابتدائی زمانہ یاد آ گیا۔اسے شروع کی محبت کی سرشاریاں' ملاقاتوں کا جوش وخروش باتوں کی گھلاوٹ ذرا ذرا سی آہٹ پر چونک اٹھنا' سکول سے گھر واپس جاتے ہوئے سرسوں کے کھیتوں اور بیریوں کے ٹھنڈے جھنڈوں میں متلاشی نگاہوں سے یاقوت کو ادھر ادھر دیکھنا' اور اس کا ہر خط گھر جا کر' کمرہ بند کر کے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پڑھنا اور پھر الماری میں چھپا کر رکھنا اور سیڑھیوں میں لگ چھپ کر ملنا یاد آ گیا۔سب کچھ یاد آ گیا۔وہ سر جھکائے رونے لگی اور بار بار نقاب کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

’’میرا مقصد تمہیں رلانا نہیں۔میں تو صرف تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں ان نیم روشن سیڑھیوں پر لے جانا چاہتا ہوں جہاں تم نے مجھ سے کبھی جدا نہ ہونے کی قسمیں کھائی تھیں۔میں تمہیں کھیتوں میں جانے والا وہ کچا راستہ دکھانا چاہتا ہوں جہاں تم اپنا گورا ہاتھ بڑھا کر مجھ سے محبت کا پیام لیا کرتی تھیں اور اسے اپنی آمیض کے اندر دل کے پاس چھپا لیا کرتی تھیں کیا میں وہ خط بھی تمہیں واپس کر دوں جس میں تم نے مجھے لکھا تھا کہ تم ساری زندگی میری ہو کر رہو گی اور اگر تمہاری شادی مجھ سے نہ ہوئی تو تم میرے ساتھ گھر سے بھاگ جاؤ گی؟کیا تمہارے سارے عہد و پیمان تمہاری جھولی میں ڈال دوں؟محض اس لئے کہ وہ جھوٹے وعدے تھے۔جھوٹی قسمیں تھیں۔ریت کے گھروندے تھے۔کاغذی محل تھے۔ہوائی قلعے تھے اور کچے دھاگے تھے؟اگر تمہیں ان خطوط کے نیچے سے بدنامی کی پھنکاریں سنائی دیتی ہیں تو مجھے تمہاری جھوٹی قسموں کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔میں ان کاغذی پھولوں کو اپنے پاس رکھ کر کیا کروں گا؟تم یہیں بیٹھو میں ابھی تمہارے خط تمہیں لائے دیتا ہوں۔‘‘

اتنا کہہ کر یاقوت اٹھا اور کیبن سے باہر نکل گیا۔ کمرے میں جا کر اس نے نجمہ کے خطوط والی صندوقچی اٹھائی اور نیچے آ گیا۔ نجمہ اتنی دیر گم سم بت بنی بیٹھی رہی۔ یاقوت نے کیبن میں داخل ہو کر صندوقچی اٹھائی اور نیچے آ گیا۔ نجمہ اتنی دیر گم سم بت بنی بیٹھی رہی یاقوت نے کیبن میں داخل ہو کر صندوقچی میز پر رکھ دی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اس کفن میں تمہارے ایک ایک خط کی لاش پڑی ہے۔ اگر تم کہو تو میں اس کا ڈھکنا کھول کر ساری لاشیں گنوا دوں تاکہ بعد میں تمہیں خیال نہ رہے؟''

نجمہ سر جھکائے خاموش رہی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ یاقوت نے صندوقچی کا ڈھکنا کھول دیا۔ حنا کے عطر کی بڑی پرانی اداس خوشبو کیبن میں پھیل گئی۔ یاقوت نے گہرا سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ذہن میں میرا بائی کا اک تارا گونجنے لگا۔

اگر چندن کی چتا جلاؤں
تو آ کر آگ لگا جا جوگی
جل جل بھٹی میں بھسم کی ڈھیری
تو اپنے رگ لگا جا جوگی
مت جا مت جا جوگی

ہلکے زرد رنگ کے محبت بھرے خطوں پر گلاب کے سوکھے ہوئے پھولوں کی تڑی مڑی پتیاں پڑی تھیں۔ ایک ایک سوکھی پژمردہ پتی اسے ایک ایک محبت بھرا واقعہ یاد دلا رہی تھی۔ دو بھولے بسرے محبت کرنے والوں کے درمیان بھولے بسرے پرانے محبت نامے پڑے تھے اور ان کی نگاہیں پتھر بنی ان پر جمی ہوئی تھیں۔ جیسے دو بوڑھے میاں بیوی اپنی شادی کے دن والا پرانا سیاہ پڑا ہوا طلائی سہرا دیکھ رہے ہوں۔ گزر گیا وہ زمانہ! ہائے کہاں گئے ان پھولوں کے چراغ جس سے باغ کا کونہ کونہ روشن تھا۔ ایسے بجھے کہ پھر جل نہ سکے۔ کیا گزرا زمانہ پھر واپس آ سکے گا؟ کیا بچھڑے ساتھ پھر مل جائیں گے؟ نہیں! نہیں! نہیں! کیا سرسوں کے کھیتوں میں پھر کوئی لڑکو سکول سے بھاگی بھاگی خط لینے آیا کرے گی؟ کیا پھر کوئی سیڑھیوں میں کھڑے دھڑکتے دل کے ساتھ کسی کا انتظار کیا کرے گا؟

نہیں! نہیں! کبھی نہیں!

میرا کے پربھو بندھن ٹوٹا

ٹوٹا کاچاسوت

ٹوٹا کاچاسوت

کچے سوت کا تاگا ٹوٹ گیا۔ منکے بکھر گئے۔ موتی سمندر میں گر گئے۔ ہیرے مٹی میں مل گئے۔

مٹی نہ پھرول جوگیا

تیرا لبھنا نئیں لعل گواچا

اے بیراگی! اب مٹی میں کیا تلاش کر رہے ہو؟ کبھی کھوئے ہوئے لال بھی واپس ملے ہیں؟ خطوں کی چھوٹی سی سیاہ صندوقچی سے اٹھتی ہوئی حنا کی اداس خوشبو اب ماند پڑنے لگی تھی۔ یاقوت نے اس کا ڈھکنا بند کر دیا۔ وہ اپنی مردہ محبت کی لاش کا ٹھنڈ سا ساکت چہرہ زیادہ دیر نہ دیکھ سکتا تھا۔

''تم یہ خط لے جا سکتی ہو نجمہ! میرے پاس تو یہ تمہاری امانت تھی یہ سارے کے سارے پورے ہیں۔ پہلے سے لے کر آخری تک محفوظ ہیں۔ یہ کہانی الف سے لے کر ے تک اس میں بند ہے۔ تم اسے چولہے میں ڈال کر جلا دو چاہے دریائے راوی میں بہا دو۔ تم ان مرجھائے ہوئے پھولوں کے ساتھ چاہے جو سلوک کرو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ ایک بات ضرور کہوں گا۔ انہیں آگ میں جھونکنے یا دریا کی لہروں کے حوالے کرنے سے پہلے ایک بار مجھے ضرور یاد کر لینا۔ یہ ضرور یاد کر لینا کہ تم نے یہ خط مجھے لکھے تھے اور بڑی محبت سے لکھے تھے۔ بڑے پیار اور عقیدت سے لکھے تھے۔ تم نے اپنی زندگی کے بیش قیمت جذبات ان کاغذوں پر بکھیرے تھے۔ انہیں دل کے انمول موتیوں کی لڑیوں سے سجایا تھا۔ اور جب ان خطوں کو دریا میں بہا چکو تو یہ مت سوچنا کہ تم نے اپنے محبت نامے دریا کی لہروں کے سپرد کئے ہیں بلکہ یہ خیال کرنا کہ تم نے ایک ایسی دلہن کی لاش لہروں میں ڈال دی ہے جو شادی سے ایک روز پہلے مرگئی تھی۔''

''اب تم جاؤ۔ تم سے محبت کرنے والا تمہارا بے حد خیال رکھنے والا تمہارا محبوب خاوند تمہاری راہ دیکھ رہا ہوگا۔''

نجمہ نے چہرا اٹھا کر محبت کی آخری دلگداز مجبور و بے کس نظر سے یاقوت کے دبلے سے چہرے کو دیکھا ریشمی رومال سے آنکھیں پونچھیں۔ آہستہ سے نقاب گرایا اور خطوں کی صندوقچی برقعے کے اندر چھپا کر کیبن سے باہر نکل گئی۔

جب وہ چلی گئی تو یاقوت پتھرائی ہوئی ویران آنکھوں سے اس میز کو دیکھنے لگا جہاں ایک سکینڈ پہلے اس کے محبت نامے اس کے پریم پتر پڑے تھے۔ اسے خود پر ایک ایسے بدنصیب باپ کا گمان ہوا جس سے اس کی طلاق یافتہ بیوی ازدواجی محبت کی آخری نشانی

اپنا بچہ بھی چھین کر لے گئی ہو۔اس نے کیب سے کلثوم کا خط نکالا اور کانپتے ہاتھوں سے اسے پڑھنے لگا۔وہ خط پورا نہ پڑھ سکا۔اس نے اپنا سر ٹھنڈے میز کی سطح سے لگا دیا اور اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے۔

گلی تو چاروں بند ہوئی ہے

میں ہری سے ملوں کیسے جا

میرا بائی یہ دوسطریں کس جانگداز لمحے میں لکھ گئی تھی؟ گلی تو چاروطرف سے بند ہو گئی۔اب میں اپنے ہری سے'اپنے محبوب سے کیسے ملوں؟ اس بند اونچی بلند چاردیواری سے کیسے باہر نکلوں؟ کون آ کر یہ دیواریں ڈھائے گا؟ چیخ کی آواز کس کے کانوں تک پہنچے گی؟ پنچھی قید خانے کی پتھریلی دیواروں سے سر پٹخ پٹخ کر مر جائے گا اور شکاری اس کی خون آلود لاش اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔پھر سورج نکلے گا' آزادی کی ٹھنڈی تازہ ہوا چلے گی لیکن پنچھی کا مردہ جسم اس کے احساس سے بے نیاز ہو چکا ہو گا۔ٹھک ٹھک۔کسی نے کیبن کی چوبی دیوار کو انگلی سے تھپتھپایا۔

''کون؟''

یاقوت نے جلدی سے سر اٹھا کر رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے پوچھا دوسری طرف سے بیرے نے کہا۔

''چاۓ لاؤں صاحب۔''

''نہیں۔''

یاقوت نے رومال اور خط جیب میں رکھا۔بالوں پر ہاتھ پھیرا اور کیبن کا پردہ اٹھا کر باہر نکل آیا۔اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہوٹل کا ایک ایک بیرا اس کی قابل رحم حالت سے باخبر ہے اور سے گھور رہا ہے اور اس پر ترس کھا رہا ہے۔وہ سر جھکائے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔دروازہ اس نے اندر سے بند کر لیا اور تکیے کے نیچے سر دے کر آنکھیں بند کر لیں۔

اس رات یاقوت دیر تک پری کے ساتھ میکلوڈ روڈ کے چوک والے ہوٹل میں بیٹھا رہا۔

پہلے وہ حکیم کے پاس اس کی دکان پر آیا۔حکیم بوتلوں میں تازہ تازہ شربت ڈال رہا تھا اور اس کا شاگرد رشید طوفا کلرک اندر بیٹھا کھرل میں کوئی دوا رگڑ رہا تھا۔یاقوت حکیم کی گدی کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔حکیم ان دنوں ایک بیوہ مگر خوشحال مریضہ کو پھانسنے کی فکر میں تھا۔اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے مریضہ کو قابو میں کر لیا تھا۔پیچ لڑ چکا تھا اور اس بیوہ کی پتنگ کٹ کر حکیم کے گھر میں

گرنے ہی والی تھی۔طوطے نے اندر سے کہا۔

''یاقوت لالہ! کل رات تم نہیں آئے۔کل بڑا مزہ آیا پرسی کا!''

''کیا ہوا تھا؟''

حکیم انگلی پر شربت چاٹ کر مسکرایا اور طوطے کی طرح گردن ہلا کر بولا۔

''کل اس نے کچھ زیادہ ہی چرس پی لی تھی۔معلوم ہوتا تھا دو سگریٹ پی کر آیا ہے۔تیسرا سگریٹ سلگا کر یہاں آ گیا اور اندر بیٹھ کر اس نے جو اپنی کرنٹ معشوقہ ایلس کی یاد میں واہی تباہی بکنا شروع کیا تو ہنستے ہنستے ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔کبھی ہاتھ اٹھا کر اسے آوازیں دیتا۔کبھی روتا اور کبھی پنجابی کے گیت گانے لگتا۔

طوطے نے کھرل پر سے سر اٹھا کر کہا۔

''لالہ! آج کل اس کی کرنٹ عشق کا بھوت کچھ زیادہ ہی سوار ہے پرسی پر؟''

تھوڑی دیر پرسی کی باتیں کرنے اور مذاق اڑانے کے بعد حکیم نے اپنی بیوہ محبوبہ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔گندے رومال سے ہاتھ پونچھ کر اس نے یاقوت کی طرف جھک کر کہا۔

''صبح پھر آئی تھی وہ۔بسنتی ریشمی قمیض میں تو قیامت ڈھا رہی تھی۔عمر تیس سے کچھ ہی اوپر ہوگی لیکن بدن لسوڑے کی طرح بھرا بھرا اور رسدار ہے۔اندر آ کر بیٹھ گئی۔میں نے بھی نبض ہاتھ میں لے لی اور مزے لینے لگا۔بولی۔رات کو پھر سر درد شروع ہو گیا تھا۔میں نے کہا ہمارے پاس آ جاؤ گی تو سر درد وغیرہ سب غائب ہو جائے گا۔بالکل کنواری لڑکیوں کی طرح شرما گئی۔ویسے لال! وجنتی مالا سے اس کی شکل بڑی ملتی ہے۔''

یاقوت نے مسکرا کر کہا۔

''اس کی ماں لگتی ہوگی۔''

حکیم نے طوطے کی طرح گردن گھمائی اور بے آواز ہنسی ہنس کر بولا۔

''اچھا کسی روز تمہیں دکھاؤں گا۔اس نے تو ایک بھی بچہ پیدا نہیں کیا۔بالکل بانجھ ہے۔خاوند کو مرے بمشکل چار سال ہوئے ہیں۔پیسے والی ہے۔لیکن بیاہ اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہے۔میری طرف کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکرایا کرتی ہے۔کہتی ہے۔حکیم جی ہمیں تو بس آپ ہی اچھے لگتے ہیں۔''

حکیم کی عینک وفورِ مسرت سے ناک پر نیچے کھسک آئی۔ اس نے جلدی سے عینک درست کی اور بگلے کے سگریٹ کا کش لگا کر ایک گاہک کے گلاس میں شربت ڈالنے لگا۔ یاقوت اس کی بے معنی باتوں سے بہت جلد بور ہو کر اٹھا اور سیدھا پری کی دکان پر آ گیا۔ پری کی دکان کھلی تھی چھت پر بلب جل رہا تھا اور پری اپنے برش اور رنگوں کے پرانے بوسیدہ ڈبے سمیٹ رہا تھا۔ یاقوت کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔

''آؤ یار آؤ۔۔۔۔۔۔۔۔دو دن کہاں غائب رہے؟''

''بس ریڑی ہو رہی ہے۔ دیکھ لو۔ یہ بورڈ سالا چھ روز سے ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ صبح سے کام کر رہا تھا۔ اب کمر ٹوٹنے لگی تو اٹھ بیٹھا۔ اچھا ہوا تم آ گئے میں ہوٹل چائے پینے جا رہا تھا۔''

ایک بڑا سا بورڈ سامنے دیوار کے ساتھ لگا تھا جس پر کتنے ہی گھڑ سوار ایک دوسرے کے آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ پری نے مٹیا کے کھدر کا کرتہ اسی رنگ کا پاجامہ اور باٹا کی چپل پہن رکھی تھی۔ یاقوت دکان کے باہر گلی میں کھڑا رہا اور پری چیزیں سمیٹتا رہا۔ اس نے بتی بجھائی دکان کا دروازہ بند کر کے تالا لگایا اور یاقوت کے ساتھ چل پڑا۔

''میدان کی طرف سے چوک میں چلتے ہیں۔ راستے میں ذرا اپنا نشہ بھی پورا کرتے جائیں گے۔''

گلیوں سے باہر نکل کر پری نے جیب سے چرس والا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔ دونوں ایک گندی مندی چیزوں اور کوڑے کباڑ سے بھرے ہوئے چھوٹے سے میدان کے ساتھ ساتھ ہو کر چلنے لگے۔ فضا میں گرمی تھی اور ہوا بالکل بند تھی۔ میدان کی طرف سے بو کے گرم گرم بھبکے آ رہے تھے۔ دائیں جانب مکانوں میں بتیاں روشن تھیں اور مٹیالے آسمان کی جانب ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔

''سنا ہے کل تم نے حکیم کی دکان پر بڑی رونق لگائی۔''

پری سگریٹ کا کش لے کر ہنسا اور بولا۔

''تمہیں کس نے کہا؟''

''حکیم کہہ رہا تھا۔''

پری نے سر کے بال پیچھے جھٹک کر کہا۔

''یار یہ حکیم تو بالکل ہی الو کا پٹھا ہے۔ رات میں نے ذرا زیادہ ہی نشہ کر لیا تھا۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے حکیم میرا برابر مذاق اڑا رہا تھا اور ایک بار تو اس نے ایلس کو گالی بھی دے دی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کی دکان پر کبھی نہیں جاؤں گا۔''

''لیکن تم وہاں ایلس کی کہانی کھول کر کیوں بیٹھ گئے تھے۔''

''ہائے ہائے لالہ! کیسی بات کردی تم نے! اپنی جان کی کہانی نہ کھولوں تو اور کیا کروں؟''

پرسی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لگا کر دھواں آہستہ آہستہ باہر نکالنے لگا۔ یاقوت نے پوچھا۔

''آج کل کس مقام پر ہے تمہارا عشق؟''

پرسی کا چہرہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''بڑا نازک مقام آ گیا ہے لالہ! اس وقت اگر دو چار ہزار روپیہ کہیں سے مل جائے تو میں اس سے شادی کر سکتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''بس یہ نہ پوچھو لالہ! اس اتوار کو میری اس سے بڑی کھل کر باتیں ہوئی تھیں۔ میں نے اس سے کہا کہ مجھ سے شادی کر لو تو میں تمہیں لے کر بمبئی کی سیر کراؤں گا۔ کہنے لگی مگر تمہارے پاس پیسے بھی ہیں؟ میرے منہ سے نکل گیا کیوں نہیں؟ بنک میں میرا پورا چار ہزار روپیہ جمع ہے کہنے لگی بنک سے روپیہ نکلوا کر میرے گھر آ جاؤ اور میں اس روز تم سے شادی کر لوں گی۔ میں نے کہا وہ روپیہ میں نے فکس کروا رکھا ہے۔ کوئی ایک ہفتے بعد ملے گا۔ کہنے لگی میں ایک ہفتہ انتظار کر لوں گی اس بات کو آج چوتھا روز جا رہا ہے اور میں پریشان ہوں کہ روپیہ کہاں سے پیدا کروں۔ اپنے پاس تو پھوٹی کوڑی نہیں۔ پچاس روپے تو ہوٹل والے کا بل ہے اور پنواڑی کے بیس روپے پچھلے ماہ سے چلے آ رہے ہیں۔ چار ہزار کہاں سے لاؤں؟''

پرسی خاموش ہو گیا۔ اب وہ میدان عبور کر کے بازار میں آ گئے تھے اور کنگ جارج رستوران بالکل سامنے تھا۔ اس کی نیلی پیلی بتیاں چمک رہی تھیں۔ یاقوت سوچ میں پڑ گیا۔ اگر اس کے پاس اتنا روپیہ ہوتا تو وہ ضرور پرسی کے حوالے کر دیتا۔ لیکن اسے تو ہر ماہ اپنی مختصر سی زمین اور باغ کے حصے میں سے پانچ سو روپے ملتے تھے جن میں سے چار سو روپے تو سگریٹ' پان' چائے کھانا دھوبی اور ہوٹل کے بل میں اٹھ جاتے اور باقی ایک سو میں وہ اوپر کا خرچ پورا کرتا اور کبھی کبھار کوئی کپڑا بنوا لیتا۔ چھوٹا بھائی جو کالج میں پڑھتا تھا وہ خود بڑے بھائی سے خرچ منگواتا اور بڑے بھائی سے یاقوت کے محض کاروباری آدمیوں کے سے تعلقات تھے۔ وہ اس سے قرض بھی نہیں مانگ سکتا تھا اور اس کی مرضی کے بغیر اپنے حصے کی زمین اور باغ بھی فروخت نہیں کر سکتا تھا۔ علاوہ بریں اگر وہ کسی طرح سے راضی کر کے باغ اور زمین بیچ بھی دے تو خود کہاں سے کھائے؟ نوکری وہ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی کام اسے نہیں آتا تھا۔ یوں بھی ایک طرح سے اپنی مجبوریوں میں جکڑا ہوا تھا۔ پرسی کی طرح وہ بھی مجبور تھا۔

اب ہوٹل آ گیا۔ دونوں اندر جا کر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ یاقوت نے چائے کا آرڈر دیا اور سگریٹ سلگا کر پری سے پوچھا۔

''اگر روپے کا انتظام نہ ہوا تو کیا کرو گے؟''

پری کے چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنی لال لال آنکھیں جھپکا کر کہا۔

''بس ربڑی کروں گا اپنی اور کیا کرنا ہے۔ ایلس کو پیڈرو بیاہ کر لے جائے گا اور میں دیوداس بنا کسی فٹ پاتھ پر لیٹر بکس کے پاس گرا چرس کے نشے میں دھت گا رہا ہوں گا۔''

''دکھ کے اب دن بیتت ناہی''

چائے آ گئی۔ یاقوت نے پیالی میں چائے بنا کر پری کے آگے رکھی۔ ''یار اگر میرے پاس روپے ہوتے تو میں بڑی خوشی سے تمہیں دے دیتا۔ لیکن اپنی حالت یہ ہے کہ ہر ماہ گاؤں سے جتنا پیسہ آتا ہے اتنا ہی خرچ ہو جاتا ہے۔ باقی رہا زمین اور باغ' اول تو بھائی کی مرضی کے بغیر بیچ نہیں سکتا اور اگر کسی طرح بیچ بھی دوں تو باقی ساری عمر بھوکوں مرنا پڑے گا۔''

''نہیں لالہ! تم کس وہم میں پڑ گئے۔ خدا دے گا۔ ضرور دے گا۔ اگر نہیں دے گا تو پری پیدا کرے گا۔ چار ہزار تو کیا اگر ایلس کی خاطر چار لاکھ بھی کرنے پڑیں تو کر کے ہی دم لوں۔ ہائے ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔۔۔ میں ایلس کو اپنی زندگی سے الگ کر سکتا ہوں بھلا؟ میں یہ کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ ایلس کو پیڈرو یا وکٹر بیاہ کر لے جائے؟ لالہ! ہم نے تو عشق میں یہی سیکھا ہے کہ آدمی کسی معشوق کی بانہہ پکڑے تو اسے توڑ نبھائے اور پھر تمہیں معلوم نہیں کہ میں نے صرف اس لڑکی کی خاطر اپنا وطن چھوڑا۔ اپنی پیاری ماں چھوڑی۔ جو میری صورت کو ترستی رہتی ہے اور جس کو میں جھوٹے دلاسوں کے خط لکھتا رہتا ہوں۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ میں ایلس کو کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ اس شہر میں ایک سے ایک لکھ پتی کروڑ موجود ہے۔ میں ان میں سے کسی ایک کی ربڑی کر دوں گا مگر چار ہزار روپے ضرور پیدا کروں گا۔''

یاقوت کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

پری نے اپنی سرخ آنکھیں میچ کر یاقوت کے ہاتھ پر گرم گرم ہاتھ رکھ کر کہا۔

''مطلب یہ کہ تم چپ رہو۔ اس اتوار کی صبح کو میں ایلس کے گھر ایک تھیلی لے کر جا رہا ہوں جس میں چار ہزار روپے کے نوٹ

ہوں گے اور شادی کی انگوٹھی ہوگی۔ اگلے اتوار کو میں اور ایلس دلہا دلن کا جوڑا پہنے گرجے سے نکل رہے ہوں گے اور ہمارے سروں پر چاول اور پھول برسائے جا رہے ہوں گے۔ دوسرے ہی روز ہم دونوں ہنی مون منانے مری چلے جائیں گے۔ ہائے ہائے ہائے۔۔۔۔۔۔! مری میں ایلس کے ساتھ کتنا مزا آئے گا۔ میں خاص طور پر ایک خوبصورت کاٹیج کرائے پر لوں گا۔ ہم آتشدان میں لکڑیاں جلا کر صوفوں پر بیٹھ جائیں گے اور شیمپئن پی کر ٹیپ ریکارڈ پر ڈانس کریں گے مجھے ڈانس آتا ہے۔ میں اسے مال کے ہوٹلوں کے سیریں کرواؤں گا۔ اسے خوب کھلاؤں پلاؤں گا۔ پھر میں کبھی چرس نہیں پیوں گا۔ دو سال ہوئے میں ایک سیزن میں مری گیا تھا۔ وہاں ایک سینما والے نے کچھ بورڈ بنوانے کے لئے مجھے بلوایا تھا۔ میں سینما کے بڑے گندے اور تمدارتہ خانے میں رہتا تھا جس کے روشندان پر پیشاب خانے کا پرنالہ گرتا تھا۔ لیکن ایلس کے ساتھ تو میں الگ کاٹیج میں یا کسی بڑے ہی شاندار ہوٹل رہوں گا۔ ہم صبح بیڈ ٹی پیا کریں گے۔ ہنی مون کے بعد ہم اپنا پاسپورٹ بنوائیں گے اور ویزا لے کر بمبئی چلے جائیں گے اور پھر وہاں سے تمہیں ہر ہفتے خط لکھتا رہوں گا۔''

یاقوت کا خیال تھا کہ پری چرس کی ترنگ میں آ کر اس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ لیکن پری اس وقت اپنے دل کی باتیں کر رہا تھا۔ اس سے اس کا دل بول رہا تھا۔ اس کی دبی ہوئی امنگوں اور مردہ خواہشات کو زبان عطا ہو گئی تھی۔ پری وہ سب کچھ کہہ رہا تھا جو وہ کرنا چاہتا تھا اور جو وہ کبھی نہیں کر سکا تھا۔۔۔۔۔۔ اور جو وہ کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی زندگی سینما کے ایک بورڈ کی طرح چوکھٹے میں جکڑی ہوئی تھی جس میں ہر روز بے جان تصویروں میں نت نئی رنگ آمیزی کی جاتی۔ کبھی مکٹ دھاری بادشاہ شاہی تخت پر بیٹھا ہوتا۔ کبھی کوئی شہزادہ اپنی محبوبہ کو محبوبہ کو گھوڑے پر بٹھا کر بھگائے لئے جا رہا تھا ہوتا۔ شہزادے کی شاہی عبا اور محبوبہ کے سنہری بال ہوا میں اڑ رہے ہوتے۔ اور کبھی بہترین سوٹ میں ملبوس ہیرو خوبصورت لباس والی ہیروئن کا ہاتھ تھامے راک اینڈ رول کر رہا ہوتا۔ پری کی جوانی ان بے جان تصویروں کے خاکوں میں رنگ بھرتے گزر رہی تھی اور گزر جانے والی تھی۔ وہ ہیرو شہزادے کی نوک پلک محبت سے یوں درست کرتا جیسے وہ اس کی اپنی تصویر ہو اور ہیروئن کی تصویر میں اس انہماک سے رنگ بھرتا جیسے وہ اس کی محبوبہ ہو۔ لیکن جب بورڈ تیار ہو جاتا اسے سینما والے اٹھا کر لے جاتے اور پری کی انگلیوں پر مختلف رنگوں کے دھبے ہی باقی رہ جاتے۔ جیسے تتلی ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس کے رنگ انگلیوں سے چپکے رہ جاتے ہیں۔ یاقوت کو پری کی بے چارگی پر بڑا ترس آیا۔ اس کا دل پری کی ہمدردی سے بھر گیا۔ اس کا اپنا دل محبت کا زخم کھائے ہوئے تھا وہ خود نجمہ کر لے کر' کلثوم کو لے کر ہنی مون منانے مری کی پہاڑیوں پر جانا چاہتا تھا لیکن نہیں جا سکتا تھا۔ کبھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بھی عمر خیالی تصویروں کے سائن بورڈ پر رنگ پھیر رہا تھا۔ اس کے بورڈ بھی

لوگ اٹھا کر لے گئے تھے اور اس کی انگلیوں پر صرف رنگوں کے دھبے ہی رہ گئے تھے۔ اسے اپنی بے چارگی بھی بڑا ترس آیا۔ اس نے بڑی محبت سے پرسی کا ہاتھ دبا کر کہا۔

''میں تمہیں یہی کہوں گا کہ تم ایلس کو بھول جاؤ پرسی۔ وہ تمہارے پاس کبھی نہ آسکے گی۔ چار ہزار روپے کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہے۔''

پرسی خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر مسکرایا۔

''کیسی بات کرتے ہو لالہ! ایلس کو بھلا دوں؟ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو بھلا دوں؟ پھر میں کس کی خاطر زندہ رہوں گا؟ پھر میں بورڈوں میں رنگ بھرنے کا کام کس کے لئے کروں گا؟ میں ایلس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اس سے شادی ضرور کرو گا۔ میں بھی چرس چھوڑ کر شیمپئن پینا چاہتا ہوں۔ میں بھی ہر روز شیو بنا کر پیڈرو کی طرح اچھے اچھے سوٹ پہننا چاہتا ہوں۔ میں بھی ایلس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر مال روڈ کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ آخر مجھ میں کیا برائی ہے؟ کیا میں انسان نہیں کیا ان خوبصورت عورتوں کے ساتھ کاروں میں گھومنے والوں کے چار کان ہیں۔ چھ چھ آنکھیں ہیں؟ آخر میں بھی ان ہی جیسا انسان ہوں۔ پھر میں ان کی طرح کیوں نہیں ہوں؟ پھر وہ میری طرح کیوں نہیں ہیں۔ پھر ان کے چہروں پر دولت کی چمک اور میرے چہرے پر غریبی' افلاس اور بھوک کی زردی کیوں ہے؟ کیا میں صبح سے شام تک اور شام سے رات گئے تک کام نہیں کرتا؟ پھر میرے پاس اچھے اچھے کپڑے اور موٹر کار ار ایلس ایسی بیوی کیوں نہیں ہے؟ ایسا کیوں ہے کہ یہ لوگ تو اپنی ماؤں بہنوں کے ساتھ ہوٹلوں میں گھومتے ہیں۔ بیویوں کو سینکڑوں روپوں کی شاپنگ کرواتے ہیں اور میری غریب ماں جالندھر میں بیٹھی اپنے بیٹے کی یاد میں تڑپ رہی ہے۔ بہن بمبئی میں اپنے بھائی کے لئے بے قرار ہے اور ان کا بھائی' ان کا بیٹا لاہور کے ایک گندے محلے کی دکان میں بیٹھا چرس پی کر گھٹیا بجا رہا ہے اور بورڈوں میں رنگ بھر بھر کر اپنی آنکھیں کھو رہا ہے؟ کیا اسے کوئی نہیں روک سکتا؟ کیا کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ بے انصاف کا ہاتھ پکڑے؟''

پرسی کی آواز خشک ہوگئی۔ اس نے پانی کا ایک گھونٹ پیا اور اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے ریستوران کے شیشوں میں سے باہر بازار کی رونق کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں جانتا ہوں یہ بے انصافی کون کر رہا ہے اور میں اس کا ہاتھ ضرور پکڑلوں گا۔ میں اس سے اپنی محنت' اپنا حق اور اپنا حصہ لے کر رہوں گا۔''

پری خاموش ہوگیا۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہوٹل کی رونق ماند پڑنے لگی تھی۔ یاقوت نے چائے کا بل دیا اور دونوں ہوٹل سے نکل کر باہر آ گئے اور فٹ پاتھ پر خاموشی سے چلنے لگے۔ یاقوت کو اس بات کا ضرور احساس ہوگیا تھا کہ پری چار ہزار روپوں کے لئے اپنی محبوبہ ایلس کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے والا ہے۔ وہ کیا کرنے والا ہے؟ اسے یہ معلوم نہ تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ پری محض جذباتی ابال میں ایسی باتیں کر رہا تھا۔ ابھی دکان پر جا کر جب وہ چرس کا دوسرا سگریٹ پئے گا تو سب کچھ بھول جائے گا۔

لیکن آج چرس کا دوسرا سگریٹ پی کر پری کچھ نہ بھلا سکا۔ اسے سب کچھ یاد رہا اسے یہ بھی یاد رہا کہ وہ آدھی رات کو کہاں جا رہا ہے اور یہ بھی پوری طرح یاد رہا کہ اس نے صبح ایک قفل ساز دوست کی دکان سے چابیوں کا گچھا کس کام کے لئے چرایا تھا؟ اس کا ذہن اتنی تیزی کے ساتھ مختلف قسم کی باتیں سوچ رہا تھا کہ اسے چرس کا نشہ بھی نہ ہوا۔ دکان کو اندر سے بند کر کے اس نے کونے میں پڑے خالی ڈرم میں ہاتھ ڈال کر چابیوں کا گچھا باہر نکالا اور چارپائی پر بیٹھ کر غور سے ایک ایک چابی کو دیکھنے لگا۔ کوئی پندرہ بیس لمبی لمبی چابیاں تھیں۔ ان میں سے کوئی نہ کوئی چابی ضرور اس تجوری کو لگ جائے گی اور اس کے جگمگاتے ہوئے مستقبل کا دروازہ کھل جائے گا۔

پری نے چابیوں کا گچھا لپیٹے ہوئے بستر کے نیچے چھپا دیا۔ چرس کا تیسرا سگریٹ سلگایا اور چارپائی پر لیٹ کر پینے لگا۔ اس کا ذہن ہزاروں باتیں سوچ رہا تھا۔ اسے طرح طرح کے خیالات بھا کر کبھی شہ دے رہے تھے اور کبھی خوف دلا رہے تھے۔ لیکن ان تمام خیالوں کے پیچھے ایلس کا چہرہ مسکرا رہا تھا اور اسے اپنی طرف، گرم آتشدان کی طرف، شیمپئن کی سلگتی ہوئی بوتل اور کوہ مری کے کاٹج کی طرف اور ہنی مون کی مہکتی ہوئی پراسرار خوشیوں بھری راتوں کی طرف بلا رہا تھا۔

پری زیادہ دیر تک نہ لیٹ سکا۔ اس نے سگریٹ بجھا دیا۔ اٹھ کر دکان کا دروازہ کھولا۔ باہر نکل کر تالا لگایا اور سٹیشن کی طرف چل دیا۔ رات بڑی خوشگوار تھی۔ اب ٹھنڈی ہوا چل پڑی تھی اور موسم خنک ہوگیا تھا۔ مسافر خانے میں جا کر اس نے چائے پی۔ بگلے کا سگریٹ سلگایا اور کتنی دیر سٹیشن پر ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ ایک سپاہی اسے گھورتا ہوا پاس سے گزرا۔ پری کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ اپنی دکان کی طرف روانہ ہوگیا۔ ایک بار پھر دکان میں آ کر وہ چارپائی پر لیٹ گیا اور عجیب عجیب قسم کے خیالات اسے دق کرنے لگے۔ اس کی جیب میں تھوڑی سی چرس رہ گئی تھی۔ اس نے اسے سگریٹ میں بھرا اور سارا سگریٹ پی گیا۔ خدا جانے کیا بات تھی۔ آج اسے نشہ بالکل نہیں ہو رہا تھا۔ حلق کڑوا ہوگیا تھا۔ ہونٹ بار بار خشک ہو رہے تھے۔ لیکن نشے کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ آخر وہ ایک دم چارپائی پر سے اٹھا۔ بستر کے نیچے سے چابیوں کا گچھا اٹھا کر اسے پاجامے کے اندر چھپایا۔ پاؤں میں چپل کی جگہ ربڑ کے پرانے نسواری جوتے پہنے اور دکان بند کر کے گلیوں سے ہوتا ہوا میدان کی جانب نکل آیا۔

چوک میں آکر اس نے پان والے کی دکان پر دیکھا۔ رات کا پورا ایک بج رہا تھا یہ وقت بڑا مناسب ہے۔ اتنا سوچ کر پرسی نے تیز تیز مال روڈ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ مال روڈ بالکل ویران تھی۔ کسی وقت کوئی موٹر کار تیزی روشنی پھینکتی ہوئی گزر جاتی۔ بہت آگے جا کر پرسی چپکے سے ایک بغلی سڑک کی جانب مڑ گیا۔ یہ سڑک ایک باغ میں سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہاں اندھیرا تھا اور قسم قسم کے پھولوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن پرسی ان خوشبوؤں سے بے نیاز گزرتا چلا گیا۔ اب وہ باغ کی دوسری جانب ایک کھلی سڑک پر آ گیا۔ کھمبوں کی روشنی سے بچتا بچاتا وہ کچھ دور چلا اور بائیں جانب ایک اور چھوٹی سی سڑک کی طرف مڑ گیا یہ دو رویہ کوٹھیوں کی قطاروں کے درمیان والی سڑک تھی۔ کسی کوٹھی میں کوئی کتا بھونکا۔ پرسی کی آنکھیں اندھیرے میں چمکنے لگیں۔ ایک پل کے لئے رک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر آگے بڑھ گیا۔ کوٹھیوں میں اندھیرا تھا۔ صرف ایک کوٹھی کے عقبی کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔

اب پرسی اس کوٹھی کی کوئی چار فٹ اونچی عقبی دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ جہاں وہ کچھ عرصہ پہلے ساگوان کی الماریاں رنگنے آیا تھا اور جس کے ایک کمرے میں اس نے سو سو کے نوٹوں سے بھری ہوئی تجوری دیکھی تھی۔ پرسی کا دل دھڑکنے لگا۔ اس نے دیوار کے اوپر سے جھانک کر اندر دیکھا۔ کوٹھی کے عقبی باغ میں مکمل تاریکی تھی۔ پرسی نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ آنکھیں بند کر کے ہاتھ سینے پر رکھ کر خدا سے جانے کیا دعا مانگی اور دیوار پھاند کر کوٹھی کے باغ میں آ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ والی جھاڑیوں کے پیچھے پیچھے چلتا آگے بڑھنے لگا۔ اب وہ کمرہ سامنے تھا جس کے اندر تجوری رکھی تھی۔ پرسی نے اندھیرے میں چیتے ایسی چمکیلی آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا۔ ہمہ تن گوش ہو کر خاموشی کو غور سے سنا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ہر طرف خاموشی ہے تو وہ گھاس پر جھکے جھکے بھاگتا سامنے والے کمرے کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ایک ایک پل بڑا قیمتی تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے بند پٹ کو ذرا سا اندر کو دبایا۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ پرسی نے اندھیرے میں آنکھیں گھما کر کونے والے پائپ کو دیکھا۔ پانی کی نالی پر ٹینکی تک چلی گئی تھی اور روشندان کے قریب سے ہو کر گزرتی تھی۔ وہ دبے پاؤں نالی کے قریب آ گیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر آہستہ آہستہ اوپر چڑھنے لگا۔ روشندان کا شیشہ بند تھا۔ اس کے آگے سیمنٹ کے پلستر کا تھوڑا سا بڑھاؤ تھا۔ پرسی اس بڑھاؤ پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اب اسے کسی بات کا خوف نہ تھا۔ ذہن پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ کسی طرح وہ کمرے کے اندر پہنچ جائے۔ اس وقت وہ خطرے کے بیچ کھڑا تھا۔ اس نے روشندان کے شیشے کو اندر کی طرف دبایا۔ شیشہ آدھا اندر کو آدھا باہر کو اٹھ گیا۔ پرسی نے ایک بار پھر صلیب کا نشان بنایا اور الٹا ہو کر ٹانگیں روشندان کے اندر کی طرف لٹکا دیں۔ اس کے پاؤں کھونٹی سے ٹکرائے۔ پرسی نے کھونٹی پر پیر رکھ دیئے اور نیچے جھانک کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ تاروں بھری رات کی ہلکی ہلکی پھیکی سی

روشنی کمرے میں پھیلی تھی۔ اس اندھی روشنی میں پرسی نے دیکھا کہ اس کے عین نیچے ایک پلنگ دیوار کے ساتھ لمبے رخ کو لگا ہے۔ پرسی نے دونوں ہاتھوں سے روشندان کے چوکھٹے کو تھام رکھا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ نکال کر روشندان کی رسی تھامی اور آہستہ سے پلنگ کی پٹی پر پاؤں رکھ دیا۔

اب وہ اس چھوٹے سے کمرے کی تاریکی میں اکیلا کھڑا تھا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ دو الماریاں لگی تھیں۔ سامنے تخت پر ش بچھا تھا۔ میز پر ٹیلی فون پڑا تھا اور تجوری پرسی کی امیدوں کا مرکز کونے میں کھڑی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ ساتھ کھسکتا تجوری کے پاس آ گیا۔ اب اس کا دل اس قدر تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ اس کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے چابیوں کا گچھا باہر نکالا اور ایک ایک چابی سوراخ کے اندر ڈالنی شروع کر دی چابی جیسے سوراخ کے اندر جا کر جام ہو جاتی نہ دائیں گھومتی نہ بائیں مڑتی اگر کوئی بھی چابی نہ لگی تو کیا ہوگا؟ پرسی کو پسینہ آ گیا۔ صرف دو چابیاں باقی رہ گئی تھیں۔ ایک دم پرسی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ آخری چابی تالے کے سوراخ میں بائیں طرف گھوم گئی تھی۔ پرسی نے آہستہ سے تجوری کا دستہ گھما کر آہنی پٹ باہر کو کھینچا۔ تجوری کھل گئی۔

اس نے اندر جھانک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ تجوری کے اوپر والے خانے میں کچھ رجسٹریاں اور کھاتے پڑے تھے۔ نیچے والا خانہ نوٹوں کی گڈیوں سے آدھا بھرا ہوا تھا۔ پرسی نے ہاتھ ڈال کر نوٹوں کو چھوا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ہنی مون کی پہلی رات کو مری کے گرم کاٹج میں آتشدان کے سامنے بیٹھا ایلس کے گالوں کو انگلیوں سے مس کر رہا ہے اس نے چھ سات موٹی موٹی گڈیاں نکال کر اپنے کرتے کی دونوں جیبوں میں گھسیڑ دیں۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

ٹرن ٹرن۔۔۔۔۔۔۔۔ٹرن ٹرن۔۔۔۔۔۔۔۔ٹرن ٹرن۔ ٹرن۔۔۔۔۔۔۔"

پرسی بجلی ایسی تیزی کے ساتھ فون کی طرف لپکا۔ اس نے فوراً چونگا اٹھا لیا۔ اندر سے منحنی آواز آ رہی تھی۔

"ہیلو فور فائیو تھری۔۔۔۔۔۔۔۔ کراچی سے بات کریں۔

ہیلو فور فائیو تھری۔۔۔۔۔۔۔۔ کراچی سے بات کریں۔۔۔۔۔۔۔۔"

چونگا پرسی کے کپکپاتے ہاتھ میں تھا۔ پیشانی سے پسینے کی بوندیں گر رہی تھیں۔ تجوری کا منہ کھلا تھا۔ نوٹوں کی گڈیاں اس کی جیبوں میں تھیں اور وہ سکتے کے عالم میں اندھیرے میں میز کے پاس کھڑا آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

ایکا ایکی بٹن کی آواز اور ساتھ والے کمرے میں بتی جل اٹھی اس کی روشنی نے دروازے کے دھندلے شیشوں میں سے اندر آ کر کمرے کو روشن کر دیا۔ کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا دروازے کی طرف آ رہا ہے۔ پرسی کا خون منجمد ہونے لگا۔ کیا کروں؟ کیا کروں؟ اس

نے فون کا رسیور میز پر رکھا۔ لپک کر تجوری کا منہ بند کیا اور بلی ایسی پھرتی کے ساتھ تخت پوش کے نیچے گھس گیا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ سانس دھونکنی کی مانند چل رہا تھا اور جسم پسینے میں شرابور تھا۔

دروازے کی چٹخنی کھلی۔ کواڑ کھلے۔ ٹچ کی آواز کے ساتھ بتی جلی۔ کمرہ بقعہ نور بن گیا اور ایک درمیانی عمر کا بھاری بھر کم آدمی سلیپنگ سوٹ میں بالوں پر ہاتھ پھرتا اندر داخل ہوا اور میز کی طرف بڑھا۔ اچانک وہ ٹھٹھک کر وہیں کا وہیں رہ گیا۔ فون کا رسیور اپنی جگہ کی بجائے میز پر پڑا تھا۔ کیا امکو وہ رسیور غلطی سے فون پر رکھنا بھول گیا تھا؟ لیکن اگر رسیور فون پر نہیں تھا تو ابھی ابھی گھنٹی کیسے بجی تھی؟ پھر ریسیور گھنٹی بجنے کے بعد کس نے اٹھایا؟

پری کو نسواری رنگ کے ریشمی پاجانے والی دو ٹانگیں گھٹنوں سے نیچے تک نظر آ رہی تھی اور چپل جس میں چوڑے چپٹے پیر پھنسے ہوئے تھے۔ پری گھبراہٹ میں ٹیلی فون کا رسیور میز پر ہی چھوڑ گیا تھا۔ اس آدمی کو بھی پسینہ آ گیا۔ اس نے دیکھا کمرے کا ایک روشندان کھلا تھا۔ وہ جلدی سے تجوری کے پاس آیا۔ ہتھے کا ذرا سا گھومنا تھا کہ تجوری کا منہ کھل گیا۔ نچلے خانے میں نوٹوں کی گڈیاں غائب تھیں۔ وہ آدمی گھبرا کر جلدی سے باہر نکل گیا اور باہر نکلتے ہی اس نے چور چور کا شور مچا کر ساری کوٹھی سر پر اٹھالی۔

پری کی چوری پکڑی گئی تھی۔ وہ ایک سکینڈ کے اندر تخت پوش کے نیچے سے باہر نکلا اور پلنگ کی پٹی پر پاؤں رکھ کر رسی تھام کھونٹی پر دوسرا پیر جما کر ہمک کر روشندان میں پہنچ گیا تھا۔ لیکن اس اثنا میں کوٹھی کے سب لوگ بیدار ہو گئے تھے۔ سارے کمروں کی بتیاں روشن ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ باہر باغ والے لان کی بتیاں بھی جل اٹھی تھیں۔ ہر طرف چور چور کی پکار مچی تھی۔ دو آدمی پستول لئے تجوری والے کمرے میں پہنچ گئے تھے اور باقی لوگ باہر روشندان کے نیچے ڈنڈے ہاتھوں میں لئے کھڑے پری کو گھور رہے تھے۔

''ڈیڈی! آپ اندر نہ جائیں۔ انکل وہاں پستول لئے موجود ہیں۔''

کچھ کھلے بالوں' نیند بھری آنکھوں والی جوان عورت مردوں کے پیچھے سہمی کھڑی روشندان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ نوکر لٹھ لئے نیچے چوکس کھڑے تھے۔ پری نے ایلس کو اپنی طرف مسکرا مسکرا کر ہاتھ کے اشارے سے بلاتے دیکھا۔ پھر ایلس کی شکل گھومنے لگی اور دھندلی ہوتی گئی اور دور ہوتی گئی اور پری کا سر روشندان کے چوکھٹے سے جالگا وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

یاقوت حسب معمول دس بجے سو کر اٹھا۔ نہا کر ناشتہ کیا اور پلنگ پر لیٹ کر کتاب پڑھنے میں محو ہو گیا۔ اصل میں اسے کلثوم کی نوکرانی کا انتظار تھا۔ کلثوم نے خط میں لکھا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ اپنی نوکرانی کو اس کی طرف خط کا جواب لینے بھیجے۔ یاقوت نے کلثوم کے نام ہی رات خط لکھ کر سرہانے کے نیچے رکھ چھوڑا تھا۔ وہ سوائے اس کے اور کیا لکھ سکتا تھا کہ وہ خاموش تماشائی بنا ایک بار پھر اپنے

آشیانے کو عین بہار میں جلتے دیکھتا رہے گا۔ آخر میں اس نے یہ بات کلثوم کو ضرور لکھی تھی کہ ان کی شادی کی اب ایک ہی صورت ہے کہ وہ گھر سے بھاگ کر یاقوت کے پاس آ جائے اور دونوں عدالت میں جا کر بیاہ کر لیں۔ لیکن وہ جانتا تھا کلثوم اس پر کبھی رضامند نہ ہو گی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو زہر کھا سکتی تھیں گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹک سکتی تھیں۔ مگر ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت کو بٹہ لگا کر گھر سے بھاگ نہیں سکتی تھیں۔ عشق میں صرف نانبائی کی لڑکی داری گھر چھوڑ سکتی تھی اگر نجمہ اور کلثوم کے اندر تھوڑی تھوڑی داری بھی ہوتی تو اتنے شدید جذباتی صدمے نہ ہوتے اور نہ ہی وہ یوں سسک سسک کر، تڑپ تڑپ کر زندہ رہنے پر مجبور کی جاتیں۔ داری میں اگر تھوڑی سی نجمہ، تھوڑی سی کلثوم بھی شامل ہوتی تو شاید وہ یوں ہاتھوں ہاتھ فروخت نہ ہوتی کراچی کے قحبہ خانوں کی زینت نہ بنتی۔ بارہ بجے یاقوت لیٹا پڑھتا رہا۔ آخر وہ تھک گیا۔ اس نے کپڑے تبدیل کئے اور کمرے کو تالا لگا کر نیچے آ گیا۔ بیرے کو اس نے خاص طور پر کہہ دیا کہ اگر کوئی ادھیڑ عمر عورت آ کر اس کا پوچھے تو کہنا کہ وہ ایک گھنٹے تک واپس آ جائے گا۔ ہوٹل سے نکل کر یاقوت محض وقت گزارنے کے لئے حکیم کی دکان پر آ گیا۔ حکیم نے یاقوت کو اشارے سے دکان کے اندر بلا لیا۔

''کچھ سنا تم نے؟''

حکیم نے عینک کے پیچھے اپنے بے جان دیدے گھما کر سرگوشی میں کہا۔ یاقوت نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا افواہیں پھیلانا اور افواہوں پر کان دھرنا حکیم کا دل پسند مشغلہ ہے۔ اس نے دری پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا اور ماچس کی تیلی گلی میں پھینکتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیا سنانا چاہتے ہو؟''

حکیم نے یاقوت کی طرف جھک کر کہا۔

''پرسی حوالات میں ہے۔''

''کیا؟''

یاقوت کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''پرسی چیرنگ کراس تھانے میں ہے۔''

''وہ کیوں؟''

''رات اس نے مرزا حیدر بیگ خیمہ ساز اس کی کوٹھی میں چوری کی اور عین موقع پر پکڑا گیا۔ پورا چھ ہزار روپیہ اس کی جیب سے برآمد ہوا ہے توبہ ہے۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے نشہ کیسا بھی ہو آخر جیل کی ہوا ضرور کھلاتا ہے۔ تم اس کی دکان کی طرف مت جانا۔ وہاں

پولیس بیٹھی ہے۔ تھانیدار میرے پاس بھی آیا تھا۔ میں نے اسے شربت وغیرہ پلایا اور کہا حضور! ہمارا اس سے بس محلے داری کا ناطہ تھا۔ کبھی کبھی دکان میں آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اب چور کے ماتھے پر تو نہیں لکھا کہ وہ چور ہے تھانیدار نے کہا فکر نہ کرو حکیم جی! ہم بھی آدمی کا فرق خوب سمجھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے چور کون ہے اور شریف کون' میں نے کہا کیوں نہیں ماشاء اللہ جہاں دیدہ ہیں اور پھر چوبیس گھنٹے ایسے لوگوں سے واسطہ رہتا ہے تھانیدار چلا گیا۔ اس وقت سے اب تک اس کے سپاہی چھ بار آ کر شربت پی چکے ہیں۔ صندل کے شربت کی آدھی بوتل خالی ہوگئی ہے۔ مگر یار اس پری کو کیا ہوگیا؟ میرا تو خیال ہے یہ شخص شروع ہی سے چور تھا۔ خدا کا شکر ہے وہ جب بھی میری دکان پر آیا میری پیسوں کی صندقچی کو تالا لگا ہوتا تھا۔ بھائی ایسے لوگوں کا کیا اعتبار۔"

حکیم اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی گئی آنکھیں پھرتی سے دائیں بائیں کا جائزہ لیتی رہیں۔ آج سے بڑا گرما گرم موضوع ہاتھ لگا تھا۔ وہ تو اس موضوع پر دو برس تک مسلسل باتیں کر سکتا تھا۔ یاقوت کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا اور وہ سر جھکائے پری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ رات اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ کر رہے گا۔ ایک بچی نے آ کر حکیم سے کہا۔

"حکیم جی دو آنے کی گلقند دینا۔"

"نی اکی اماں سے کہنا انار دانے کی چونی ابھی نہیں آئی۔"

بچی ہنسنے لگی۔ حکیم نے گلقند کاغذ میں لپیٹ کر اس کے حوالے کی اور پانی سے بھرے ہوئے تسلے میں ہاتھ ڈال کر اس پر ہلکا سا چھینٹا پھینکا۔ بچی ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔ حکیم نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

"شاید پولیس تمہارے پاس بھی آئے۔ تم یہ نہ کہنا کہ تمہاری اس سے بڑی یاری تھی۔ یہاں ایسے موقعوں پر آدمی کو اپنی عزت کا خیال ضرور رکھنا چاہئے۔ ہم تو شریف آدمی کے ساتھی ہیں۔ چور کی دوستی نہیں کر سکتے۔"

پری نے ایلس کے لئے چوری کی تھی۔ وہ ایلس سے شادی کر کے اپنا گھر بسانا چاہتا تھا۔ اپنی زندگی بہتر بنانا چاہتا تھا۔ اپنے پیدا ہونے والے بچوں کی بہتر طریق سے نشوونما کرنا چاہتا تھا۔ ایلس کے ساتھ مری میں ہنی مون منانا چاہتا تھا۔ اسے ساتھ لے کر اپنی ستم رسیدہ ماں کے پاس جانا چاہتا تھا۔ پندرہ برس کی بچھڑی ہوئی پیاری ماں' محبت کرنے والی ماں کے قدموں میں جانا چاہتا تھا۔ بمبئی جا کر اپنی بہن سے ملنا چاہتا تھا۔ اس کے مستقبل کا شاہی قلعہ وجود میں آتا تھا۔ لیکن اگر وہ ایسی بیس زندگیاں صبح سے شام تک سینما کے بورڈوں پر مسلسل کام کرتا رہتا تو چار ہزار روپے پیدا نہ کر سکتا تھا۔ اس کی جوانی خشک ریت کی طرح اس کی مٹھی میں سے نکل کر گرتی جا

رہی تھی۔ ایلس دوسرے کی آغوش میں جا رہی تھی۔ ماں سرحد پار کر کے اندھیروں میں گم ہو رہی تھی۔ بہن کی آواز مدھم ہوتی جا رہی تھی اور اس کی اپنی زندگی سینما کے پرانے بورڈوں کے ارد گرد زخمی چمگاڈر کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ بے حیثیتی' کم مائیگی اور بے زری کے شدید احساس نے پری کو انتہا پسند بنا دیا اور اس نے ایسا قدم اٹھا لیا جو ان حالات میں ہر نوجوان اٹھانا چاہتا ہے لیکن ہر نوجوان ان حالات میں ایسا قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یاقوت کے ذہن میں پری کے ایک رات پہلے کے الفاظ گونجنے لگے۔

''سب جانتے ہیں کہ ہم سے بے انصافی کی جا رہی ہے۔ اور کسی میں اتنی جرات نہیں کہ بے انصافی کرنے والے کا ہاتھ پکڑ لے۔ لیکن میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔ آخر مجھ میں اور دوسرے لوگوں میں کیا فرق ہے؟ کیا میں ان جیسا انسان نہیں ہوں؟ کیا میں صبح سے شام تک اور شام سے رات گئے تک کام نہیں کرتا؟ پھر ایسا کیوں ہے کہ وہ عیش کرتے ہیں اور میں پیٹ بھر کر روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔۔۔۔۔۔۔؟''

یاقوت ہوٹل واپس آیا تو اسے معولم ہوا کہ کلثوم کی نوکرانی خط دے گئی ہے۔

زرد لفافے میں زرد کاغذ تھا جس پر چھ سات سطریں لکھی ہوئی تھیں۔ کچھ آنسوؤں کے نشان تھے۔ کچھ ہلکی ہلکی حنا کی اداس کر دینے والی مہک تھی۔ یاقوت نے دو تین بار خط پڑھا اور پلنگ پر بیٹھ کر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ کلثوم نے گھر سے بھاگنے سے معذوری کا اظہار کیا تھا۔ بھائی محلے والوں کو کیا منہ دکھائیں گے؟ باپ کی عزت برباد ہو جائے ماں غم سے مر جائے گی۔ رشتے دار انگلیاں اٹھائیں گے۔۔۔۔۔۔۔ وہ تمام باتیں تھیں جن کے بارے میں گھر سے بھاگنے سے پہلے ہر لڑکی سوچتی ہے۔ اور جو نہیں سوچتی اس کا وہی حشر ہوتا ہے جو داری کا ہوا۔ کلثوم نے ٹھیک فیصلہ کیا ہے اسے گھر سے ہرگز فرار نہیں ہونا چاہئے۔ اگر لڑکیوں نے ایسا کرنا شروع کر دیا تو باپ مجبور ہو جائیں گے کہ وہ پیدا ہوتے ہی لڑکی کا گلا دبا دیں۔ مجھے کلثوم کو فرار کی دعوت نہیں دینا چاہئے تھی۔ یاقوت نے سوچا۔

وہ سگریٹ جلا کر کھڑکی کے پاس آ گیا۔ سڑک پر ٹریفک جا رہی تھی۔ لوگ آ جا رہے تھے بسیں' رکشے' سکوٹر اور موٹریں شور مچاتی گزر رہی تھیں۔ یاقوت کو ایک گہری' ویران اور بے کنار تنہائی کا احساس ہوا۔ جیسے وہ کسی چھوٹے سے ویران جزیرے میں اکیلا بیٹھا ہو۔ اور سب جہاز سب لوگ اسے چھوڑ کر چلے گئے ہوں۔ تنہائی اور خود فراموشی کی اس تھمی تھمی' رکی رکی سی فضا میں اسے حنا اور اگر کی خوشبو محسوس ہوئی۔ گویا وہ مزار کے باغیچے میں کھڑا دعا مانگ رہا ہے۔ اسے میرا بائی کا خیال آیا۔

اگر چندن کی چتا بناؤں

تو آ کے آگ لگا جا

جوگی مت جامت جا

یاقوت بھی اگر چندن کی چتا بن گیا تھا۔ اسے کون آ کر آگ لگائے گا؟ جوگی تو چلا بھی گیا۔ مندر کے باہر پیپل کے پیڑ تلے پجارن گاتی ہی رہ گئی۔ جوگی مت جا! مت جا! مت جا! مگر جوگی چلا گیا۔ پجارن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا بہہ رہی ہے اور اداس دوپہر میں کھیتوں کے بیچوں بیچ جانے والی پگ ڈنڈی دور تک ویران ہے۔ جوگی چلا گیا۔ نجمہ چلی گئی۔ اسلام پور کے مالٹوں کے باغوں کی کچی منڈھیروں پر بیٹھ کر اپنی محبت کی قسمیں کھانے والی نجمہ چلی گئی۔ اصغر ایڈووکیٹ کی بیوی بن کر اپنے گھر چلی گئی۔ پرانے قصبائی مکان کی نیم روشن سیڑھیوں میں ریشمی رومال دانتوں تلے داب کر مسکرا مسکرا کر تکیھی اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھنے والی نجمہ چلی گئی۔ اس کے گال کا سیاہ تل پھڑ کتا رہ گیا۔ ہونٹوں کی پھولوں بھری ٹہنی پر بیٹھی کالی کوئل جدائی کی فریاد کرتی رہ گئی اور نجمہ چلی گئی۔ لڑکی کے بکس کا ڈھکنا کھل گیا اور تیز زمستانی ہوائیں چیختی چلاتی آئیں اور نجمہ کے محبت بھرے خطوں' اس کے پریم پتروں کو اڑا لے گئیں۔ درختوں کی ٹہنیوں پر سے پتے جھڑنے لگے اور ساری کی ساری ٹہنیاں ننگی ہو گئیں اور سارے کے سارے زرد پتے جھڑ گئے اور زمین پر زرد پتوں کا' خشک پتوں کا فرش بچھ گیا' جدائی کا فرش بچھ گیا' اس فرش پر مل کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے والوں کی ملاقات ہوگی۔ دو زرد پتے خشک داس سرگوشی میں ایک دوسرے سے باتیں کریں گے اور پھر تیز ہوا کا جھونکا آئے گا اور ایک ایک کو پورب' دوسرے کو پچھم کی طرف اڑا لے جائے گا۔ کون جانے پھر کس جنم میں' کس روپ میں' کس بھیس میں ملاقات ہو! اور کیا خبر پھر کوئی جنم نہ آئے' کوئی بھیس نہ بدلا جائے' کوئی روپ نہ دھارا جائے ۔۔۔۔۔۔۔

ایک مہیب سناٹا' ایک لامحدود خاموشی' اور ایک ہولناک بے آرزو خلا چاروں طرف پھیلا ہو۔ کہیں کچھ نہ ہو۔ کہیں کوئی نہ ہو۔ نہ آواز نہ رنگ' نہ خوشبو اور نہ گلابی گالوں کا سیاہ تل اور نہ نسواری آنکھوں کا خاموش بلاوا ۔۔۔۔۔۔۔

سومیتا! سومیتا! تیار پور کی وہ نرم و نازک اداس بنگالی لڑکی جو منہ اندھیرے اٹھ کر بھجن گایا کرتی تھی! کیا پھر کبھی اس کی تخن' پر اسرار' غمگین مکھڑے کے درشن نہیں ہوں گے؟ کیا پھر کبھی ان کمل کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹوں سے اٹھتی آواز سنائی نہیں دے گی؟ نہیں نہیں کبھی نہیں پتا ڈالی سے ٹوٹ گیا۔ پون اڑا کر لے گئی۔ اب کے بچھڑے کہاں ملیں گے؟ کہاں ملیں گے؟

تو اگر کی بتیاں سلگا کر گھر سے نکلا تھا۔ شہر تک آتے آتے ان کی تمام خوشبو دھواں بن کر اڑ گئی۔ اب تیرے ہاتھوں میں سوائے راکھ کے اور کچھ نہیں۔ یہ خوشبو کی راکھ ہے۔ تیری یادوں کو اگر کی چتا پر ستی کر دیا گیا ہے۔ اس راکھ سے انگ بھبھوت مارے جوگی اور اس

دیس کوچ کر جا۔ بہار اپنے ہاتھ پیلے کر کے رخصت ہوگئی۔ پت جھڑ آ گئی۔ ایک ایک کر کے سارے کے سارے زرد پتے جھڑ گئے' تو اکیلی ٹہنی پر اداس بیٹھا کیا سوچ رہا ہے؟ اڑ جا! اڑ جا پنچھی۔۔۔۔۔۔۔! بھول جا! اس ننھی سی شوخ چنچل ندیا کی لہر کو جو تجھ سے ہمکنار ہوکر' تیرے کنارے کے لب چوم کر گزر گئی تھی۔ وہ تو اب ایک عظیم' ہیبت ناک سمندر سے جا ملی ہے۔ تو اس بے وفا لہر کی یاد میں آنسو کیوں بہا رہا ہے؟ کیا تجھے بدھ مندر کی سیاہ چشم دیوداسیوں کا گیت یاد نہیں جو وہ عود سلگا کر ساکیہ منی بیراگی شہزادے کی یاد میں گایا کرتی تھیں؟

''ہم تو جہاں گرد ہواؤں کی آوازیں ہیں
ہم کہاں سے چلی تھیں؟ ہم کہاں جا کر ٹھہریں گی؟
ہمیں کچھ خبر نہیں!

اے شہزادے! زندگی کا سفر' ہوا کا سفر ہے تو بھی ہوا کا آوارہ جھونکا بن کر ہمارے ساتھ چل نکل! زندگی جہاں گرد ہواؤں کی آواز ہے

اور ہم جہاں گرد ہواؤں کی آوازیں ہیں۔۔۔۔۔۔۔''

یاقوت کھڑکی سے ہٹ گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا ہو۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ پنکھا چل رہا تھا لیکن کمرے کی فضا گرم تھی اور کونے والی میز کے گلدان میں اکیلا گلاب مرجھایا ہوا تھا۔ کبھی وہ کلثوم کے لئے تازہ اور شگفتہ گلاب لایا کرتا تھا۔ جس روز کلثوم کو آنا ہوتا وہ بڑے بڑے گلاب اور لارنس باغ سے لا کر گلدان میں سجا دیتا۔ ان کی کچھ پتیاں نوچ کر میز پر اس طرح بکھیر دیتا جیسے اپنے آپ گری ہوں اور کمرہ بند کر کے باہر نکل جاتا۔ پھر جب ملاقات کے وقت سے بیس منٹ پہلے آتا تو کمرہ گلاب کی خوشبو سے مہکا ہوا ہوتا۔ وہ بے چینی سے کلثوم کا انتظار کرتا۔ پھر دروازہ آہستہ سے کھلتا اور چمکیلی آنکھوں اور نازک ہاتھوں والی پر اسرار کلثوم کچھ شرماتی کمرے میں داخل ہوتی اور وہ آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیتا۔ ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ میں کلثوم کے ہونٹوں سے ایک مہکی سی آہ نکل جاتی اور یاقوت اس کے ریشمی' دھڑکتے گلے پر اپنے ہونٹ رکھ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا گیا اس نے ریشم کی گٹھڑی میں بندھے ہوئے گلابوں کو اپنے سینے سے لگا لیا ہو۔ گویا اس نے وشم آویت کے جنگل میں مجور کیشی کے بدھ مندر کو اپنی گود میں لے لیا ہو لیکن آج نہ وشم آویت کا جنگل تھا اور نہ مجور اکیشی کا بدھ مندر اور نہ ریشمی گلاب۔۔۔۔۔۔۔ وہ صبح سویرے کی صورت والی کلثوم! جس کے چاندی ایسے ماتھے کے پسینے کو چنبیلی کی خوشبو سے لدی

ہوئی خشک کر دیا کرتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔
اور جسے یاقوت نے پہلے پہل لاہور ہوٹل والے چوک میں دیکھا تھا۔ ریشمی سنجاف والا سیاہ برقع' سفید ریشمی شلوار' گھبرائی ہوئی چال' نقاب کی جال میں چمکتی دو نسواری آنکھیں اور سفید گال پر جھولتا سفید آویزہ۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ گلابی ایڑیاں جو بدن کا بوجھ پڑنے پر سفید ہو جاتیں' سنگ مرمر کی ہو جاتیں!

اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ باتیں بھی یاد آئیں جن کے بارے میں یاقوت کا خیال تھا کہ وہ انہیں کبھی یاد نہ رکھ سکے گا۔
محبت ناکام ہونے کے بعد پیچھے کو لوٹتی ہے۔ جب وہ محبوب کے گلے میں بانہیں ڈالے آگے بڑھ رہی ہوتی ہے تو اندھی ہوتی۔ لیکن جب ناکام ہو کر پیچھے پلٹتی ہے تو اس کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں اور وہ چھوٹی سے چھوٹی شے کو بھی بڑے غور سے دیکھتی ہے۔
دو محبت کرنے والے جب راتوں کو چھپ چھپ کر ملتے ہیں تو وہ آسمان پر چمکنے والے چاند کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن جب ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جاتے ہیں تو انہیں وہ بے حقیقت گھاس بھی یاد آتی ہے جس پر لیٹ کر انہوں نے ایک دوسرے کا منہ چوما تھا۔ یاقوت کو گزری ہوئی محبت کی ایک ایک بات یاد آ رہی تھی۔ یہاں وہ کلثوم کو پہلی بار ملا تھا۔ یہاں اس نے پہلی بار کلثوم کی آواز سنی تھی۔ اس سڑک پر سے ٹیکسی میں گزرتے ہوئے کلثوم نے قہقہہ لگایا تھا۔ اس درخت کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے بارش میں کلثوم کا انتظار کیا تھا۔ وہ خوبصورت لمحے جو کبھی پھول بن کر اس کی تمناؤں کے گلدانوں میں مہکا کرتے تھے اب آفت زدہ ماضی کے سانپ بن کر اس کی یادوں کو ڈس رہے تھے۔ اسے وہ پریم پتر یاد آ رہے تھے جو حنا کے عطر میں بسے ہوئے تھے۔ جن پر جگہ جگہ عطر کے دھبے ہوتے تھے۔ جن کی تہوں میں گلاب کی شگفتہ پتیاں رکھی ہوتی تھیں۔ محبت کے سوگ میں خوشی ہے اور اس کی خوشی میں سوگ ہے۔ یہ ہمیشہ سوگوار رہتی ہے۔
رات کو یاقوت سو نہ سکا۔ وہ ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ گرمیوں کے ٹھنڈے نیلے آسمان پر ستارے چمک رہے تھے۔ وہ کتنی ہی دیر سڑکوں پر آوارہ گھومتا رہا۔ ایک کوٹھی کے لان میں سے رات کی رانی کی مہک آئی۔ اس نے کوٹھی کی جانب دیکھا وہاں گھپ اندھیرا تھا اور گھنی جھاڑیوں میں کہیں کہیں کوئی جگنو چمک جاتا تھا۔ لاہور شہر اسے خوبصورت سپنوں کی خوفناک تعبیریں بتانے والا نجومی لگنے لگا تھا۔ وہ چلتے چلتے اسمبلی ہال تک آ گیا۔ سڑک کنارے کے باغ میں گلاب کے پیازی پھول کھل رہے تھے۔ وہ رک گیا۔ آگے بڑھ کر اس نے ایک پھول کی پنکھڑی پر ہونٹ رکھ دیئے۔ گلاب کا خوشبودار سانس اسے اپنی روح کی گہرائیوں میں اترتا محسوس ہوا۔ یاقوت نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنسوؤں کے دو قطرے اس کی بند پلکوں سے ڈھلک پڑے۔

اپنے کمرے میں واپس آ کر اس نے بجلی کی کیتلی میں کافی بنائی۔ کافی کے چو چار گھونٹ پی کر وہ پلنگ پر دراز ہو گیا۔ پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اس نے الماری میں سے اخروٹ کی لکڑی کا منقش ڈبہ نکال کر کھولا۔ حنا کی پرانی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔ جیسے اس نے کسی پرانے باغ کا دروازہ کھول دیا ہو۔ ڈبے میں نجمہ کا ایک بھی پریم پتر نہیں تھا۔ کلثوم کے کچھ خط پڑے تھے۔ بے جان خط! کبھی شکنتلا اپنے پریمی راجہ دشنیت کو کنول کی پتیوں پر خط لکھ کر بھیجا کرتی تھی۔ پھول کی پنکھڑی پر کنول کے ڈنٹھل سے خط لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی پریمی اپنی محبوبہ کے رخسار پر ہونٹ رکھ کر اسے اپنی محبت کا یقین دلائے۔ لیکن یہ سیاہی بھرنے نوکیلے قلم سے بیجان کاغذ پر پریم پتر لکھنا کس نے ایجاد کیا؟ دنیا کا پہلا محبت بھرا خط کس عاشق نے لکھا تھا؟

محبت کے خط محبت سے زیادہ حسین ہوتے ہیں۔ محبت مر جاتی ہے۔ محبت نفرت میں بدل جاتی ہے مگر خط زندہ رہتے ہیں۔ محبت کی نشانیاں بن کر زندہ رہتے ہیں۔ ملایا اور جنوبی سمندروں سے آنے والی ہواؤں! محبت کی ان نشانیوں کو ان پھولوں کو سدا شگفتہ اور شاداب رکھنا! کیونکہ محبت کرنے سے محبت بھرے خط لکھنا زیادہ خوبصورت بات ہے۔

یاقوت نے کلثوم کے خطوں کو انگلیوں سے چھوا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے نہایت خوبصورت نہایت پاکیزہ لیکن مری ہوئی دوشیزہ کے گال کو چھو لیا ہو۔ اس نے صندوقچے کا ڈھکنا بند کر دیا۔ پرانے باغ میں رہے گا۔ وہ اس کا ایک حصہ ہے۔ اسی کے گھنے آسیبی درختوں کا سایہ ہے۔ اب یہ سایہ پرانے زرد چاند کی ویران راتوں میں بھٹکتا پھرے گا۔ اب کشتہ محبت کی روح کھنڈر بنے قلعے کے گرد آلود حجلہ عروسی کے در و دیوار سے سر پٹکا کرے گی اور دیواروں پر اگی ہوئی خشک گھاس پر گال رکھ کر سرد آہیں بھرا کرے گی۔ اگر خوشبو کی روح ہے تو پھول کی لاش ہے۔ خوشبو اڑ گئی۔ اب پھول کی سرد لاش کو سینے سے لگائے سنسان کہساروں کے گنجان تاریک جنگلوں میں بھٹکتے پھرنا ہو گا۔ اب سرد اندھیری راتوں کی کہر بن کے گمنام مقبروں کی سبز سے ڈھکی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر اترنا ہو گا اور گرد آلود تاریک غلام گردشوں کی سنگین جالیوں پر منہ رکھ کر رونا ہو گا اب گزرے ہوؤں کو یاد کر کے بین کرنے ہوں گے۔ اب انہیں آوازیں دینا ہوگی جو کبھی پلٹ کر نہیں آئیں گی۔ اب خزاں کے پاؤں پر سر رکھ کر کہنا ہو گا کہ وہ بہار کی دلہن کے سارے شگفتہ پھول واپس کر دے۔ اب جھڑے ہوئے زرد پتے سے التجا کرنی ہوگی کہ وہ ایک بار صرف ایک بار پلٹ کر اپنی ٹہنی پر چلا جائے۔ اب سورج دیوتا سے ہاتھ جوڑ کر کہنا ہو گا کہ وہ اپنے جھولے میں سے دلہن کی بیتی ہوئی سہاگ رات واپس کر دے۔۔۔۔۔۔۔

صرف ایک رات کے لئے واپس کر دے!

لیکن یہ کبھی نہ ہو گا۔ دریا میں گری ہوئی انگوٹھی واپس مل سکتی ہے مگر وقت کے سمندر میں گری ہوئی سہاگ رات پھر واپس نہیں آ

سکتی۔سہاگ رات شادی کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔وہ گزر جاتی ہے۔بسر ہو جاتی ہے اور انگوٹھی باقی رہتی ہے۔نگینہ باقی رہتا ہے۔یہ نگینہ یاد ہے۔اور یاد سہاگ رات سے خوبصورت' زیادہ حقیقی ہے۔یاد محبت کی روح ہے جس طرح خوشبو پھول کی روح ہے۔پھول مرجھا جاتا ہے۔محبت مرجاتی ہے۔لیکن اس کی یاد باقی رہتی ہے۔سہاگ رات باقی رہتی ہے۔

گھروں کے دروازے بند ہو گئے۔کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے گئے۔اندھیرا خاموشی کا ہاتھ پکڑے شہروں اور جنگلوں میں اتر آیا۔گلیاں سنسان ہو گئیں۔پنکھ پکھیرو اپنے گھونسلوں میں جا چھپے۔ٹھنڈے فٹ پاتھ ویران ہو گئے۔اب تو سرد کھمبے سے لگا پائپ منہ میں دبائے کس کا انتظار کر رہا ہے؟ اب تو اس سٹاپ پر سے آخری بس بھی جا چکی۔اب تو کس کی راہ دیکھ رہا ہے؟ تجھ سے ملنے والی تو اپنے کمرے کی بتی بجھا کر بستر پر محو خواب ہے۔نکل چل! نکل چل یہاں سے۔تو اس شہر میں اجنبی ہے تو ہر شہر میں اجنبی ہے۔برما کی تیکھی چتونوں والی دیوداسیاں ناریل کے جھنڈوں میں سے ہو کر مندروں کو جا رہی ہیں اور بارش میں ان کی آنکھوں کا کاجل گالوں پر بہنے لگا ہے۔وہ تجھے بڑی بڑی پلکیں جھپکا جھپکا کر اپنے پاس بلا رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔اے بارش! تیرا شکریہ!

میں نے کالی سیڑھیوں میں ان کے کنول پھول ایسے دودھیا بدن کبھی نہیں دیکھے تھے۔پانی میں شرابور بدن۔۔۔۔۔۔۔۔جیسے بارش میں بھیگی رات کے پیچھے منہ اندھیرے کا سانولا پن جھلک رہا ہو۔پریم کی خوشبوؤ! برساتی رات کی جادوگر نیو برما کی دیوداسیو! لنکا کی سندلڑکیو! سارناتھ کے آم کے درختو! میں تمہاری طرف آتا ہوں۔میں بند مکانوں کی سلاخ دار کھڑکیوں اور پتھریلے فٹ پاتھوں کے ٹھنڈے کھمبو کا پنجرہ توڑ کر تمہاری طرف آتا ہوں۔میری محبت نے ناشپاتی کے کھلے ہوئے سفید پھولوں والے باغوں میں جنم لیا تھا۔میرے باغ مدھ مکھیوں کی گنگناہٹ سے گونج رہے تھے۔میرے آم کے درختوں سے شہد ٹپکتا تھا۔اور میرے آلوچے کے پیازی پھولوں پر راجپوت شہزادیوں کے جھمکوں کا گمان ہوتا تھا۔میرے باغ کی ہواؤں میں ناچنے والی لڑکیوں کے سیاہ بال ان کے گلابی چہرے ڈھانپ لیا کرتے تھے جنگلوں میں چھائی ہوئی راتوں کے خاموش بلاوے ہمیں پراسرار سرگوشیوں میں اپنی برف بلایا کرتے تھے۔اور ہم سبز آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتے' اور ناچتے جاتے تھے۔اور میں اس وحشیانہ رقص میں ایک جگہ رک رک کر کھڑا ہو جاتا اور جنگلی کنواریوں کو دیکھتا جنہوں نے مہوا کی چھال سے سے اپنے ہونٹ رنگے ہوتے اور جنگلی داکھ سے اپنے پپوٹوں کو نیلا کیا ہوتا اور سانولے رس بھرے بدن پر کنول کے پھول کا برادہ چھڑکا ہوتا تھا۔اور پھر میں آنکھیں بند کر لیتا اور شرابی ہواؤں کے جھونکے مجھے رقص کی گردش کرتی منڈلی میں لے جاتے اور میں اس آسمانی ناچ کے بھنور میں اتر جاتا۔۔۔۔۔۔۔۔ایک ٹرک شور مچاتا سڑک پر سے گزر گیا۔

یاقوت کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس جھکائے کھڑا تھا۔ اس کا پائپ بجھ چکا تھا۔ اس نے دو تین بار پلکیں جھپکا کر نیچے سڑک پر دیکھا اور کھڑکی بند کر دی۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا اس نے لاہور شہر کا دروازہ بند کر دیا ہو۔ وہ کھڑکی سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا اور کھوئی کھوئی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ کبھی یہ پٹ ذرا سا کھلتا تھا اور کلثوم کا مسکراتا چہرہ اندر جھانک کر دیکھا کرتا تھا۔ لیکن اب یہ دروازہ بھی بند ہے۔ کھڑکی بھی بند ہے۔ اوپر چھت ہے اور نیچے سنگین فرش۔

گلی تو چاروں بند ہوئی ہے

میں ہری سے ملوں کیسے جا

میں ہری سے ملوں کیسے جا

اسے اپنے آپ پر میرا بائی کا گمان ہوا۔ گلی بند ہے۔ چاروں طرف بند ہے۔ میں ہری سے کیسے ملوں؟ کیسے ملوں۔۔۔۔۔۔؟ اس نے کھڑکی کھول دی۔ ایک رکشا شور مچاتا سڑک پر سے گزر گیا۔ دور لوکوشاپ کا بھونپو چیخ اٹھا۔ یاقوت نے جلدی سے کھڑکی پھر بند کر دی۔ اب کھڑکی کبھی نہیں کھلے گی۔ اب مندر کے پٹ دوبارا نہیں کھلیں گے۔ میں دود لوبان کی خوشبوؤں کا بادل لے کر گھر سے نکلا تھا کہ ساری کی ساری خوشبوئیں شہر کی گرد اڑاتی پر شور سڑکوں پر لٹ گئیں۔ اب میں مندر میں اکیلا ہوں اور میرے سامنے ساکیہ منی شہزادہ گوتم ہے اور میرے دل کی سانگری میں عود لوبان کے جنگل سلگ رہے ہیں اور اس سماوی خوشبو کا ایک ہلکا سا سانس بھی باہر نہیں جائے گا۔ یہ ساری کی ساری میری ہوگی اور میرے سارے کا سارا اس کا ہوں گا۔ یاقوت نے اس مقدس رات کو یاد کیا جب شہزادہ سدھارتھ نے محل سے باہر آ کر اپنے رتھ بان کو جگایا اور کہا۔

''چنا! جاگو اور میرے سفید گھوڑے کنتک کو باہر لے آؤ۔''

چنا گھبرا کر اٹھا اور شہزادے کو دیکھا ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''میرے آقا! آپ اس وقت سواری کریں گے جبکہ آدھی رات ہے اور بستیاں جنگل سو رہے ہیں۔''

شہزادہ سدھارتھ نے اپنے مقدس ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔

''آہستہ بولو چنا! گھوڑے کو باہر لے آؤ۔ میں جا رہا ہوں۔ سونے کے پنجرے کو توڑ کر جا رہا ہوں۔ سچائی کی تلاش میں۔ جو مجھے ضرور مل جائے گی۔ محبت کے لئے جدا ہو جاؤ چنا! اور میرا گھوڑا لاؤ!''

اور پھر شہزادہ شاہی گھوڑے پر سوار ہو گیا اور جنگلوں جنگل ہوتا دور دراز علاقوں میں نکل آیا۔ پھر ایک جگہ وہ رکا اور گھوڑے سے

نیچے اتر آیا۔ اس نے اپنے لمبے بال جو اعلیٰ ترین خوشبوؤں سے مہک رہے تھے کاٹ کر اپنے رتھ بان چنا کے حوالے کئے اور کہا۔

''یہ میرے راجہ باپ کو دے دینا اور کہنا تمہارا بیٹا دس گنا بڑا شہزادہ بن کر واپس لوٹے گا۔''

اور جب گیارہ برس بعد شہزادہ گوتم بدھ ہو کر واپس آیا تو اس کا خوبصورت بالوں والا سر منڈا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ایک پیلی چادر تھی اور وہ بھنگیوں کے دروازوں پر بھیک مانگتا اپنے باپ کی راجدھانی میں داخل ہو رہا تھا۔ مندر کے قریب موڑ پر جہاں سے جنوبی پھاٹک دکھائی دیتا تھا راجہ کے سامنے ایک ہجوم آ گیا اور ان سب کے آگے آگے ایک شخص جا رہا تھا جس کی پر سکون آنکھیں اپنے راجہ باپ سے چار ہوئی۔ رنجیدہ ابروؤں پر بدھ کی حلیم نظروں کا پڑنا تھا کہ باپ کا غصہ کافور ہو گیا۔ پھر نہایت عجز و انکسار کے ساتھ بدھ گھٹنوں کے بل ہو کے اپنے باپ کے سامنے زمین پر جھک گیا۔ زمین کے بادشاہوں سے زیادہ جلال اس وقت بھکاری شہزادے کے چہرے پر تھا۔ پھر راجہ نے کہا۔

''یہ بھی میری قسمت کا لکھا ہے کہ میرا شہزادہ بیٹا چوروں کی طرح میری مملکت میں داخل ہو۔ سر منڈا ہو' چیتھڑے پہنے' پاؤں میں کھڑائیں اور شوروں سے بھیک مانگتا۔ میرے بیٹے! اس وسیع سلطنت کے وارث! تجھے اپنی شان کے مطابق آنا چاہئے تھا۔ چمکتی ہوئی تلواروں اور کودتے ہوئے گھوڑوں کے درمیان۔ دیکھو! میرے تمام جانباز سپاہی راستوں میں چھاؤنیاں ڈالے اور میرا تمام شہر پھاٹکوں پر آنکھیں لگائے تمہارا انتظار کر رہا ہے۔

میرے بیٹے! یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے؟''

تب بدھ نے کہا۔

''میری قوم کی یہی ریت ہے۔

''تیری قوم!'' راجہ نے کہا ''تیری قوم مہاست سے لے کر سونسلوں تک حکومت کرتی آئی ہے۔ لیکن ایسی ریت اس میں کوئی نہیں ہے۔''

بدھ مت نے نہایت ادب سے کہا۔

''میں نے اپنی قوم کا ذکر کیا تھا میرے عظیم باپ! میں وہی کر رہا ہوں جو میری قوم کے لوگوں نے کیا۔۔۔۔۔۔۔ اور جس طرح اب ہوا ہے۔ اس طرح آئندہ بھی ہوگا کہ اپنے شہر کے سجے ہوئے دروازے پر ایک راجہ باپ فوجی لباس میں ملبوس اپنے بیٹے سے ملے گا جو گیروے کپڑوں میں ہوگا اور جس کے ہاتھ میں کشکول ہوگا۔''

تھا گتو! تھا گتو! لاانتہا کو الفاظ نہ نہ ماپ۔ نہ ہی خیالات کی رسی کو اتھاہ سمندر میں پھینک۔ جو پوچھتا ہے بھول کرتا ہے۔ جو بتاتا ہے وہ بھی بھول کرتا ہے۔ ہر پردے کے پیچھے ایک اور پردہ گرتا ہے۔ تاریکی چمک نہیں سکتی۔ خاموشی بول نہیں سکتی۔ ماں باپ کی پوجا کرو۔ مشرق سمجھ کر جہاں سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ دھرم کو سامنے رکھو۔ اصول کو سامنے رکھو۔ اپنے حواس پر قابو پاؤ۔ جس طرح بلوریں موتیوں میں سے لڑی کا دھاگا نظر آتا ہے اسی طرح نیک اعمال میں سے محبت نظر آتی ہے۔ دن نکلنے سے پہلے کی آسمان کی روشنی بن جاؤ اور سورج کے ساتھ طلوع ہو کر اس عظیم آفتاب! تیرے طلوع ہونے کا وقت آ پہنچا ہے اور میرے دل کی پنکھڑی پر شبنم کے قطرے تیری صورت دیکھنے کو ترس رہے ہیں۔۔۔۔۔۔۔"

صبح ہونے سے پہلے یاقوت نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ میکلوڈ روڈ چھوڑ دی۔ لاہور شہر چھوڑ دیا۔ وہ سٹیشن پر آ کر راولپنڈی جانے والی ریل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ریل گاڑی پنڈی کی طرف چل پڑی۔ لاہور شہر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ گندمی کے سنہرے کھیتوں اور کیکرے کے بسنتی پھولوں والے خوشبودار درختوں کے لیے جگہ چھوڑنے لگا۔ ریوالی سینما گزر گیا۔ مصری شاہ اور فاروق گنج کا علاقہ گزر گیا۔ شاہدرہ اور بادامی باغ گزر گیا۔ باادب باملاحظہ ہوشیار! باادب باملاحظہ ہوشیار! جہانگیر کا ستان مقبرہ اور نور جہاں کی ویران تربت گزر گئی۔ گاڑی راوی کو بھی پیچھے چھوڑ آئی۔

وگدی اے راوی چن وے

وچ دو پھل کالے ڈھولا

اک پھل منگیا سوہنے

سارا باغ حوالے ڈھولا

راوی کی لہروں پر بہتے وہ کالے پھول کس قدر ہیبت ناک ہوں گے جن کے مانگنے پر عاشق نے اپنی محبوبہ کو سارا باغ عطا کر دیا تھا۔ راوی گزر گیا۔ جہانگیر نور جہاں گزر گئے شاہدرے کی اونچی لمبی بھدی چمنیوں والی ملیں گزر گئیں۔ گاڑی کھیتوں میں سے گزرنے لگی۔ آسمان پر برسات کی گھٹائیں چھا گئیں۔ ٹھنڈی نم آلود ہوائیں ریل کے ڈبے میں آنے لگیں۔ اسلام پور پہنچ کر گاڑی آگے چل دی۔ یاقوت اٹیچی کیس تھامے سٹیشن سے باہر آ گیا۔ اسی سٹیشن پر اسی پلیٹ فارم پر کبھی اس نے بڑی بے قراری سے نجمہ کا انتظار کیا تھا۔ اور نجمہ کا قاصد ایک رقعہ لایا تھا جس میں نجمہ نے لکھا تھا کہ وہ گھر سے بھاگ کر اس کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ وہ بھاگنے کا پروگرام بنا سکتی ہے لیکن گھر سے بھاگ نہیں سکتی۔ ٹھیک لکھا تھا اس نے۔ کسی بھی لڑکی کو گھر سے بھاگنا نہیں چاہئے ہر لڑکی کی آخری منزل گھر

ہے۔ پھر گھر سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے؟

ٹاپ ٹاپ۔۔۔۔۔۔۔۔بوندا باندی شروع ہوگئی۔

بادلوں کی کاجل لگی کالی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اور یہ آنسو پلیٹ فارم کے سرخ اینٹوں والے فرش اور کنارے کے شیشم کے درختوں اور کیکرے کے پیڑوں اور دھان کے کھیتوں اور ان کے بیچ سے ہو کر جانے والی کچی پگ ڈنڈیو پر بکھرنے لگے یاقوت گھٹاؤں کے ان برستے آنسوؤں میں اپنے آم' لوکاٹ اور امرود کے باغ والے اکیلے مکان کی طرف روانہ ہوگیا۔ بوندا باندی نے بارش کی جگہ لے لی تھی۔ اب بارش ہو رہی تھی اور یاقوت ایک کچی پگ ڈنڈی پر بارش میں بھیگتا چلا جا رہا تھا اور لاہور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ نجمہ کلثوم پری اور اس کی محبوبہ ایلس بہت پیچھے رہ گئی تھی' بارش کی بوندیں پڑنے سے پگ ڈنڈی میں سے گیلی مٹی کی مہک اٹھ رہی تھی۔ کیکر کے پیلے پھولوں سے لدے درختوں پر طوطے بول رہے تھے اور بارش میں بھیگی شاخوں کو ہوائیں جھولا جھلا رہی تھیں اور خوشبو اڑا رہی تھیں۔ یاقوت بارش میں شرابور ہوگیا تھا۔ اس کے کپڑے بھیگ کر اس کے جسم سے چپک گئے تھے نجمہ اور کلثوم سے یہ کپڑے اچھے تھے۔ نجمہ اور کلثوم سے یہ بارش اچھی تھی۔ بارش ہر نجمہ اور ہر کلثوم سے اچھی ہے۔ بارش امر ہے۔ نجمہ اور کلثوم غیر امر ہیں۔ بادل زور سے گرجا۔ بارش زیادہ تیز ہوگئی۔ برسات کی پوری جھڑی لگی تھی۔ یاقوت بارش کی راجدھانی میں داخل ہو رہا تھا۔ گوتم بدھ نروان حاصل کرنے کے بعد بھکاری کے روپ میں اپنے راجہ باپ کی راجدھانی میں داخل ہوا تھا۔ یاقوت گیان حاصل کرنے کے بعد اپنی بارش ماں کی راجدھانی میں داخل ہو رہا تھا۔ بارش ماں ہے۔ وہ کھیت میں گرنے والے ہر قطرے سے ایک خوشہ پیدا کرتی ہے۔ بارش کے قطرے یاقوت کے ماتھے پر آنکھوں پر بہہ رہے تھے۔ اسے یوں' لگ رہا تھا جیسے اس کی پیار ماں کبھی اس کے ماتھے' کبھی آنکھوں اور کبھی گالوں کو چوم رہی ہو۔ یہ برسات کے بادل نہیں تھے۔ یہ ساون کی بدلیاں نہیں تھیں۔ یہ ممتا کی گھٹائیں تھیں۔ یہ پیاری ماں کی آغوش تھی جو پورب سے پچھم اور اتر سے دکھن تک پھیلی ہوئی تھی اور چھما چھم برس رہی تھی۔

ماں کی محبت امر ہے

بارش کی محبت امر ہے

ایک ہزار ایک سو ننانوے کلثومیں اور ایک ہزار ایک سو ننانوے نجمائیں اس ماں کی محبت میں جذب تھیں۔ اس ممتا کے سمندر میں غرق تھیں۔ اس ایک ماں کے گرد ہزاروں سورج' لاکھوں ستارے گردش کر رہے تھے۔ انہی ستاروں میں' انہیں سورجوں میں کہیں کوئی نجمہ تھی' کہیں کوئی کلثوم اور کہیں کوئی ایلس تھی۔ نقش مٹ گئے تھے۔ لہریں سمندر میں گم ہوگئی تھیں۔

بارش! پیاری بارش!

ماں! پیاری ماں!

میں قطروں سے نکل کر دریا میں آ رہا ہوں ۔ میں دریاؤں سے نکل کر سمندر میں آ رہا ہوں۔ صندل کا عطر میری ریشمی قمیض سے لگا تھا۔ اس کی خوشبو مجھے صندل کے جنگلوں میں لے آئی ہے۔ خوشبوؤں کے گنجان جنگلوں میں لے آئی ہے۔ اندھیرے جنگلوں کی سرگوشیاں کرتی خوشبوؤں میں لے آئی ہے۔ جنگل خوشبو ہے۔ خوشبو جنگل ہے۔ راستہ دو! اے جنگلو! راستہ دو! اے خوشبوؤں!

بارش! بارش! بارش!

بادل پھر زور سے گرجا۔ ممتا پھر جوش میں آئی۔ یاقوت نے اپنا چہرہ اوپر اٹھالیا۔ بوندیں اس کی بند آنکھوں پر پڑنے لگیں۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دور اسلام پر قصبے کے مکانوں کی دھندلی دھندلی دیواریں نظر آنے لگی تھیں۔ انہی مکانوں میں ایک مکان نجمہ کا بھی تھا۔ ایک مکان یاقوت کی۔۔۔۔۔۔۔ بھابی کا بھی تھا جس کی سیڑھیوں میں یاقوت نے عید کے روز خوشبوؤں میں مہکی نجمہ کو اپنے ساتھ لگالیا تھا اور کے گوٹہ لگے ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ میں دونوں کے ہونٹوں سے ایک آہ نکل گئی تھی۔ وہ مہکی ہوئی ریشمی آہ! محبت کی یہ پر اسرار مہکی ہوئی نیم روشن سیڑھیاں اہرام مصر میں اور ان اہراموں میں مہکی ہوئی ریشمی آہیں مصر کی جواں سال سیمین شہزادیاں ہیں جن کی حنوط شدہ لاشیں ہر سیڑھی میں ہر اہرام میں دفن ہیں۔

کیا کبھی یہ اہرام بھی کھولے جائیں گے؟ کیا کبھی ان شہزادیوں کی حسین لاشوں کی آنکھوں میں بھی جھانک کر دیکھا جائے گا؟"

موسلادھار بارش میں یاقوت اپنے باغ والے مکان کے بند دروازے کے پاس آ کھڑا ہو گیا۔ کبھی اس کاٹج کے کمرے میں نجمہ سکول سے واپس آ کر گھبرائی گھبرائی سی بیٹھا کرتی تھی اور جلدی جلدی دو ایک بار اس کے سینے سے لگ کر گھر چلی جایا کرتی تھی۔ بارش میں آم لوکاٹ اور ناشپاتی کے درخت رو رہے تھے۔ یاقوت نے جیب سے چابی نکال کر تالے میں گھمائی اور دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اٹیچی کیس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ گرد آلود بستر پر اوندھے منہ گر پڑا۔ بادل زور سے گرجا۔ بارش! پیاری! بارش!

ماں! پیاری ماں!

◆◆◆